www.allurdu.com

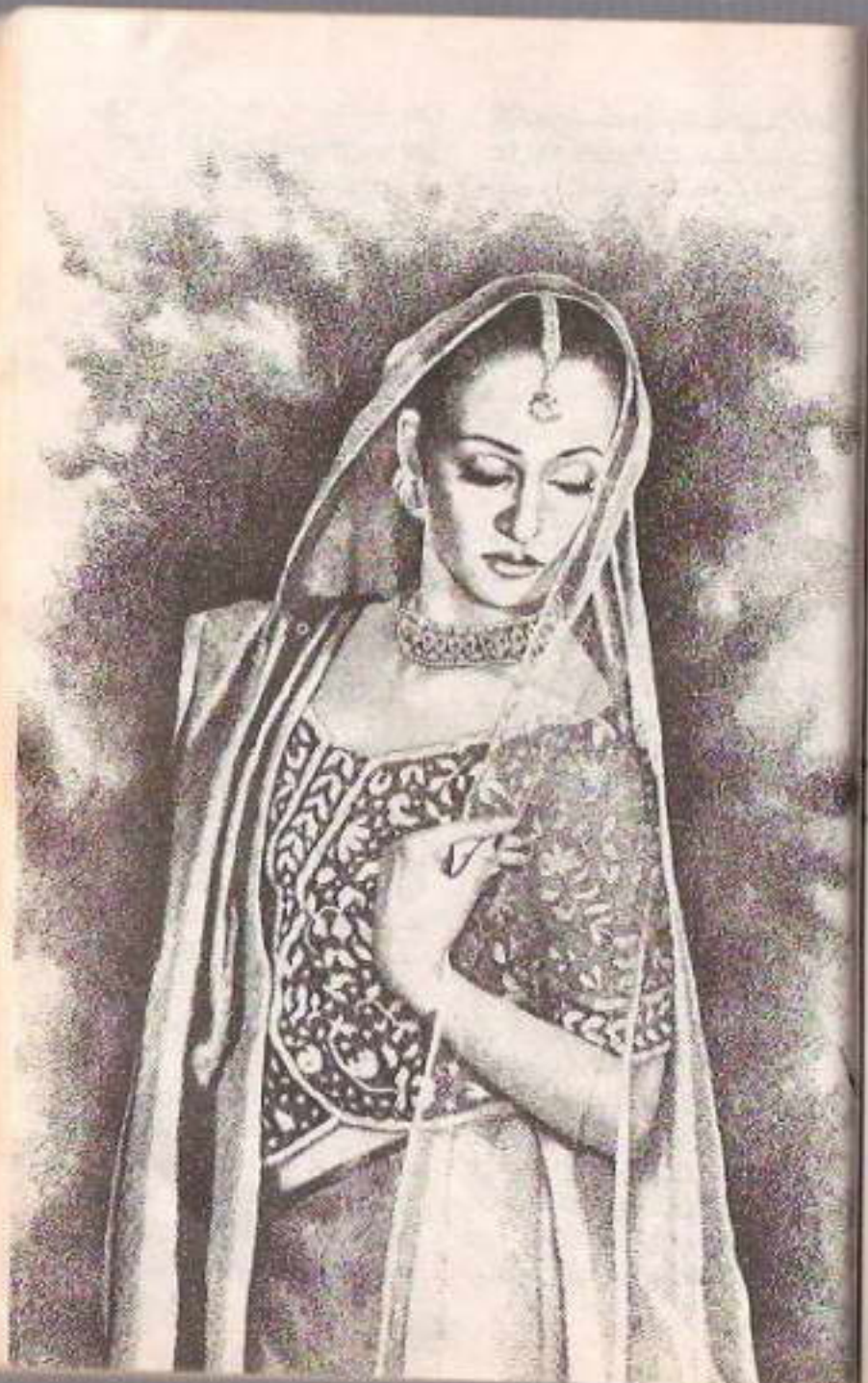

نگہت سیما

حصارِ ذات

اور آج مجھے سکندر علوی کے گھر سے آئے پورا ایک برس ہو گیا ہے۔ اور یہ ایک سال میں نے انگلیوں کے پل صراط پر گزارا ہے۔

لوگ کہتے ہیں "انتظار میں لذت ہوتی ہے۔" لیکن میں نے تو ایک ایک لمحہ جس طرح کاٹا ہے، میں ہی جانتی ہوں۔ ہر صبح ایک امید کے ساتھ طلوع ہو کر رات کو ایک طویل تھکن کے ساتھ جب میں اپنے بستر پر لیٹتی ہوں تو میری آنکھیں موتیوں کے ہار پروتی ہیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس کا اتنا انتظار ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے یقین ہے کہ وہ لوٹ آئے گا۔ وہ مجھے واپس بلا لے گا۔

حالانکہ اس کے ساتھ گزارا ہوا کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہے جو میرے یقین کو پختہ کرے۔ پھر بھی ایک انتظار ہے، جو ختم نہیں ہوتا۔ ابھی کل ہی بلال کہہ رہا تھا۔

"ممی! کیوں اپنے آپ کو اذیت دیتی ہو۔ تمہیں ابھی ایک طویل زندگی گزارنی ہے۔ تم اس سے آزادی مانگ لو اور اگر وہ انکار کرے تو عدالت کا سہارا لو۔"

اور بلال کی بات پر میرے اندر جیسے بارش ہونے لگی تھی۔

مکمل ناول

"نہیں مجھے سکندر سے رہائی نہیں چاہیے۔ ایک روز شاید ایک روز وہ لوٹ آئے۔ وہ دل کا برا نہیں ہے۔ بس اس کے ساتھ کوئی پرابلم ہے۔ کوئی نفسیاتی پرابلم۔"

اور بلال مجھ پر ایک زخم بھری نظر ڈال کر خاموش ہو گیا تھا۔ میں جانتی ہوں میری وجہ سے سب دکھی ہیں۔ ڈیڈی کس قدر کمزور ہو گئے ہیں۔ ممی کو بھی چپ سی لگ گئی ہے اور ڈیڈی کتنی ہی بار مجھ سے معذرت کر چکے ہیں۔

"میں تم سے شرمندہ ہوں بیٹی۔ میں نے ایک دکھ کی تلافی کرنا چاہی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک اور دکھ مول لے لوں گا اور یہ دکھ اس دکھ سے کتنا بڑا ہے اور کتنا اذیت ناک۔ تم بھی مجھے معاف کر

www.allurdu.com

رہتا۔"

"ڈیڈی پلیز! اس طرح مت کہیں۔ یہ میری قسمت ہے۔ آپ نے تو اپنی طرف سے میرے لیے ایک بہترین لڑکا چنا تھا۔"

میں چاہتی ہوں کہ ڈیڈی کا احساس ندامت کم ہو جائے وہ شرمندہ نہ ہوں لیکن ڈیڈی تو جیسے ہنسنا ہی بھول گئے ہیں۔

سکندر علوی ایک بہترین لڑکا تھا۔ اس میں شک ہی کیا ہے اگر ہم دونوں کا نباہ نہیں ہو سکا تھا تو یہ مقدر کی بات تھی قسمت کے کھیل تھے۔ جب پہلی بار میں نے سکندر علوی کو دیکھا تو اس کی شخصیت سے متاثر ہوئی تھی۔ اس کی شخصیت میں بہت کشش تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک عجیب سا حزن تھا۔ شکن تھی۔ ناراضی تھی۔ اور وہ بہت بے نیاز سا سعد خان کے آفس میں بیٹھا فائلوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔

جب سعد خان نے میرا تعارف اس سے کروایا۔

"مس اوج کمال! یہ سکندر علوی ہیں۔ ہمارے سینئر انجینئر بہت جینئس اور اس پراجیکٹ پر آپ ان کو اسسٹ کریں گی اور آپ کو ان کے ساتھ کام کر کے یقیناً مزا آئے گا۔"

سکندر علوی نے ذرا کی ذرا فائل سے سر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا اور سر کے اشارے سے وش کیا تھا اور اس لمحے میں نے سوچا تھا کہ یہ شخص سکندر علوی۔ اس کا نام سکندر کس نے بہت سوچ سمجھ کر رکھا ہے۔ اسے دیکھ کر لگتا ہے جیسے یہ واقعی دنیا فتح کرنے نکلا ہے۔ کشادہ پیشانی اونچی کھڑی ناک۔۔۔۔ میں بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی جب اس نے سر اٹھا کر دوبارہ مجھے دیکھا۔

"مس اوج! اگر آپ میرا تفصیلی مطالعہ کر چکی ہوں تو ہم کچھ دیر اس پراجیکٹ پر بات کر لیں۔"

میں شرمندہ ہو گئی۔ اس نے کچھ نقشے میرے سامنے پھیلائے یہ اس پلازہ کا نقشہ تھا جس پراجیکٹ پر ہمیں کام کرنا تھا پھر ماڈل دکھایا۔ کافی دیر تک وہ مجھ سے مختلف سوالات کرتا رہا میں نے اندازہ لگایا کہ وہ صرف مجھے جانچنا چاہتا ہے میرے علم کو اور میری ذہانت کو اور اس فیلڈ میں میرے تجربے کو۔ میں نے دو سال پہلے ہی جاب اسٹارٹ کی تھی اور اس سے قبل کراچی آفس میں تھی۔ اور میرا زیادہ کام آفس ورک کا تھا۔ میں نے سائٹ پر جا کر اس سے قبل کام نہیں کیا تھا۔

"لیکن اس بار تو آپ کو میرے ساتھ سائٹ پر بھی جانا پڑے گا۔"

وہ مسکرایا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کی مسکراہٹ بہت دلکش تھی اور اس کا تاثر اس کے پورے چہرے پر دکھائی دیتا تھا۔

"او کے!" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس سے اجازت لے کر اٹھ گئی۔ ہم تین دن قبل ہی کراچی سے آئے تھے اور میں نے ممی سے وعدہ کیا تھا کہ گھر سیٹ کرنے میں ان کی مدد کروں گی۔ دراصل ڈیڈی کی جاب کے سلسلے میں ہم طویل عرصہ سے کراچی میں مقیم تھے اور اب جب ڈیڈی نے ریٹائرمنٹ لے لی تھی تو ممی نے فیصلہ کیا تھا کہ واپس لاہور چلا جائے۔۔۔۔ لاہور میں ہمارا ذاتی گھر تھا ماڈل ٹاؤن میں ہمارا مشترکہ خاندانی سسٹم کے تحت ہم سب یعنی ہمارے علاوہ میرے دو چچا بھی رہتے تھے۔ لیکن ڈیڈی کے کراچی جانے کے کچھ عرصہ بعد دونوں چچا باری باری اسٹیٹس چلے گئے۔ جس کی وجہ سے گھر بند پڑا تھا۔ صرف ایک پورشن میں کرایہ دار رہتے تھے۔

ہم تقریباً" آٹھ سال بعد لاہور آئے تھے اگرچہ میں اپنی جاب کی وجہ سے ابھی کراچی میں رہنا چاہتی تھی لیکن پھر ممی اور ڈیڈی کی خواہش کے پیش نظر میں نے جاب چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن سعد خان نے کہا کہ صرف اس مسئلے کے لیے جاب چھوڑنا ہرگز ضروری نہیں ہے۔ ہم آپ کا ٹرانسفر لاہور کر دیتے ہیں۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا کہ میں نے اپنا استعفیٰ ڈائریکٹ سعد خان کو دیا تھا جو ان دنوں کراچی آفس میں آئے ہوئے تھے۔ آج میں صرف جوائننگ رپورٹ دینے آئی تھی۔ میں نے سعد خان کو بتا دیا تھا

کہ میں کل سے آفس اٹینڈ کروں گی۔

میں گھر آتے ہوئے غیر ارادی طور پر سکندر علوی کے متعلق سوچتی رہی۔ مجھے ذہین لوگ اٹریکٹ کرتے تھے۔ ذہانت میری کمزوری تھی اور میں نے سوچا تھا" واقعی اس شخص کے ساتھ کام کرنے میں مزا آئے گا لیکن اگلے چند دنوں میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ شخص اپنی ذہانت سے قطع نظر ایک انتہائی مشکل شخص ہے اور اس کے ساتھ کام کرنا آسان نہیں۔ اس کے موڈ کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ اچھے خاصے موڈ میں بات کرتے کرتے یکدم اکھڑ جاتا۔ میں اسے اور اس کی فطرت کو سمجھ نہیں سکی تھی۔۔۔۔ وہ کبھی تو بہت مہربان اور مشفق لگتا۔ اپنے ماتحتوں کے ساتھ ہمدردی کرتا ہوا۔ ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا ہوا۔

کبھی بڑی سے بڑی غلطی کو نظر انداز کر دیتا اور کبھی ذرا سی غلطی پر بے عزتی کر دیتا۔

مجھے اس کی ذہانت اٹریکٹ کرتی تھی۔ لیکن اس کی گھڑی میں ماشہ اور گھڑی میں تولہ والی کیفیت سے الجھن ہوتی تھی۔

کئی بار میں نے محسوس کیا تھا کہ میرے ساتھ اس کا رویہ باقیوں کی نسبت زیادہ سخت تھا جو کبھی کبھی توہین آمیز ہو جاتا لیکن پتا نہیں کیوں مجھے اس پر کبھی غصہ نہیں آیا۔

یقیناً" اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔ اس کی آنکھوں کا حزن بعض اوقات اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ ایسا لگتا جیسے اس کا وجود سر تا پا اداسی کے غبار میں لپٹا ہوا ہے۔ پتا نہیں کیوں میں اکثر اس کے متعلق تنہائی میں سوچنے لگی تھی۔ اس لیے نہیں کہ مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو [illegible] پھرتی ہیں۔

حوا کی بیٹیاں جو کسی آدم کو دیکھ کر بعض اوقات اپنی انا اور اپنی عزت نفس تک کو فراموش کر دیتی ہیں۔ مجھے عورت کا خود کو اس طرح ارزاں کرنا ہرگز پسند نہیں ہے۔ ایک بار اپنی ایک ٹیچر سے اس موضوع پر بات کرتے ہوئے میں بہت جذباتی ہو گئی تھی۔

"ہر بات اور شے کے لیے ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ ہر ایک کو وقت پر وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو اسے ملنا ہوتا ہے پھر ہم خود کو ارزاں کیوں کر لیتے ہیں۔"

دراصل ان دنوں ہماری ایک کلاس فیلو مونا کے متعلق یہ سنا جا رہا تھا کہ وہ کسی لڑکے کے ساتھ انوالو ہے اور اکثر یونیورسٹی آنے کے بجائے اس کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔

اور جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ تو اس نے انتہائی ڈھٹائی سے کہا۔

"آج کل گھر میں بیٹھی سیدھی سادی لڑکیوں کے لیے اچھے رشتے نہیں آتے اس کے لیے خود کوشش کرنا پڑتی ہے۔ احمد ایک اچھا لڑکا ہے۔ اچھی فیملی ہے دولت ہے اور پھر اگر وہ میری طرف متوجہ ہوا ہے تو میں یہ چانس کیوں مس کروں۔"

مجھے اس کی بات پر افسوس ہوا تھا اور اس روز اپنی ایک پرانی ٹیچر سے مونا کی بات کرتے ہوئے میں جذباتی ہو گئی تھی۔

"مونا کے مقدر میں اگر احمد کا ساتھ لکھا ہے تو اسے مل جائے گا۔ لیکن پتا نہیں کیوں وہ یہ بات نہیں سمجھتی۔"

تب میڈم زہدی مسکرائی تھیں۔

"مجھے تمہارے خیالات جان کر خوشی ہوئی ہے اوج! لیکن ہم بڑے مشکل دور سے گزر رہے ہیں۔ عورت نے خود کو کیوں ارزاں کر لیا ہے اس کی وجوہات ہیں جن میں ایک Latemarriages (دیر سے شادی ہونا) بھی ہیں۔"

میں سکندر سے محبت نہیں کرنے لگی تھی لیکن اس کی شخصیت کا تضاد مجھے اسے سوچنے پر مجبور کرتا تھا۔ اس روز ہم سب بہت خوشگوار موڈ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

اسد ملک اور مسز صالحہ جو کمپیوٹر لیب کی انچارج

www.allurdu.com

"میرا خیال ہے کہ اس کے مزاج کے پیچھے اس کے گھریلو حالات ہیں۔ ماں کا بہت کم عمری میں چھن جانا اور سوتیلے رشتوں کا ناروا سلوک۔۔۔ شاید محبتیں۔۔۔ سچی اور خالص محبتیں اس کا مزاج بدل دیں۔"

میں نے حیرت سے ڈیڈی کی طرف دیکھا۔

"آپ شاید بہت زیادہ جانتے ہیں سکندر کو۔ لیکن اس سے پہلے آپ نے کبھی ذکر نہیں کیا۔"

"اس سے پہلے میں اسے جانتا بھی نہیں تھا اوج بیٹے! میں پہلی بار کل شام ہی اس سے ملا ہوں۔ وہ اسد ملک کے ساتھ آیا تھا یہاں۔"

"اسد کے ساتھ یہاں۔ لیکن کیوں؟" میں نے پھر پوچھا۔

"میں نے اسے بلایا تھا۔"

"آپ نے لیکن کیوں ڈیڈی؟"

مجھے ڈیڈی کی باتوں پر حیرت ہو رہی تھی۔

"دراصل۔" ڈیڈی نے بہت غور سے مجھے دیکھا۔

"اس کا پروپوزل آیا ہے تمہارے لیے۔"

"نہیں۔" مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ سکندر علوی نے مجھے پروپوز کیا ہے۔ اسپاسیبل بھلا وہ مجھے کیسے پروپوز کر سکتا ہے۔ اس کے کسی رویے سے اس طرح کی کوئی بات ظاہر نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے دل میں میرے لیے کوئی جذبہ رکھتا ہے۔ ایک لمحہ کے لیے میرے دل کی دھڑکن تیز ہوئی مگر دوسرے ہی لمحے میں نارمل ہو چکی تھی۔ ابھی کل شام ہی تو ہم تقریباً تین گھنٹے تک اکٹھے بیٹھے ڈسکشن کرتے رہے لیکن اس نے ایک بھی اس طرح کی کوئی بات نہیں کی تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے اوج! اس پروپوزل کے متعلق؟"

ڈیڈی کے ساتھ میری ہمیشہ سے بہت دوستی رہی تھی اور ہم ہر موضوع پر بے تکلفانہ بات کر لیا کرتے تھے لیکن پھر بھی ڈیڈی کے یکدم پوچھنے پر میں ایک لمحہ کو خاموش ہو گئی تھی۔

"بیٹا! تم سوچنا۔ مجھے اور تمہاری ممی کو سکندر بہت اچھا لگا ہے۔ جہاں تک اس کے اس پل پل بدلتے مزاج کی بات ہے تو شاید۔۔۔ یہ اتنی بڑی خامی تو نہیں ہے۔"

ڈیڈی کے نزدیک یہ اتنی بڑی خامی نہ تھی لیکن میں جتنا سوچتی مجھے لگتا جیسے اس کے ساتھ زندگی گزارنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ یہ شخص کھلتا نہیں ہے۔ اس نے خود کو بہت سارے پردوں کے پیچھے چھپا رکھا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ کام کے دوران جتنا وقت گزارا تھا میں نے اس کا ایک ایک لمحہ سوچا۔

بلاشبہ وہ بہت ہمدرد تھا۔

بہت کیئرنگ تھا۔ اسے پیچھے سے محبت نہ تھی۔ اس کے کردار میں کوئی کمزوری نہ تھی۔ میں نے اسے کبھی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے نہیں دیکھا تھا۔ ہمارے آفس میں لڑکیاں بھی کام کرتی تھیں۔ جن میں جوان بھی تھیں اور خوبصورت بھی۔ میں نے اس کے رینک کے کئی لوگوں کو دیکھا تھا۔ اس سے عمر میں بڑے بھی تھے اور اس کے ہم عمر بھی۔ لڑکیوں کو دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھار وہ رکیک مذاق بھی کر جاتے تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ورکنگ وومین جو گھر سے نکلتی ہیں تو ان کی کوئی عزت نفس نہیں ہوتی۔ لیکن سکندر میں یہ بات نہ تھی۔

وہ سب کی عزت کرتا تھا۔ تکریم کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں غلاظت نہ تھی۔

پتا نہیں کیوں میرے اندر اس کی طرف سے ایک خدشہ تھا۔ خوف سا تھا۔ میں نے ڈیڈی کی آنکھوں اور لہجے سے اس کے لیے پسندیدگی محسوس کی تھی لیکن میں یہ بھی جانتی تھی کہ ڈیڈی یا ممی مجھ پر کبھی اپنی مرضی مسلط نہیں کریں گے۔

اس رات نیند مجھ سے روٹھ گئی تھی۔ میں ہاں اور نہ کے درمیان لٹک رہی تھی۔ کبھی دل میں اس احساس سے دھڑکنیں خوشگوار ہو جاتیں کہ یہ شخص جو سب میں نمایاں اور منفرد ہے اس نے مجھے پروپوز کیا ہے اور کبھی اس کے مزاج کا تضاد مجھے ستا رہا تھا۔

"سکندر ایک مشکل شخص ہے ڈیڈی۔" میں نے فیصلہ کر لیا اور ڈیڈی کو بتایا۔

"مثلاً۔۔۔؟" ڈیڈی نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"میں نے تجزیہ کیا ہے کہ سکندر کی ذات و شخصیت میں کوئی کمی ہے۔ وہ کبھی کبھی بہت سخت ہو جاتا ہے۔"

"بیٹا! ممکن ہے آج تک کسی نے اس کی ذات کے تشنہ گوشوں کو ٹٹولنے کی کوشش ہی نہ کی ہو۔ اور کیا تم یہ کام نہیں کر سکتیں اوج؟"

میں نے چونک کر ڈیڈی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی۔ درخواست تھی۔

"دنیا میں کوئی انسان بھی پرفیکٹ نہیں ہوتا اوج! اور پھر جب سکندر میں اتنی بے شمار خوبیاں ہیں تو کیا اس کی اس ایک خامی کو اگنور نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ آج کل کے دور میں لڑکوں نے بے شمار علتیں پال رکھی ہوئی ہیں۔"

تب اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ ڈیڈی چاہتے ہیں کہ میں ہاں کر دوں۔

"بیٹا! میں نے اس سے بہت دیر بات کی میں نے محسوس کیا کہ وہ اندر سے بہت بکھرا ہوا ہے۔ بہت ٹوٹا ہوا۔

میرا دل کہتا ہے اوج! تم اسے سنبھال لوگی۔ ایک بار پھر سوچ لو اگر دل میں کچھ گنجائش پاؤ تو۔۔۔"

میں نے ڈیڈی کی آنکھوں میں دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ یکدم مسرت سے ڈیڈی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"مجھے یقین ہے اوج! اگر تم سکندر کے ساتھ ایک بہترین زندگی گزارو گی۔" انہوں نے میرے سر پر بوسہ دیا۔

ڈیڈی کو یقین تھا۔ میں بے یقین تھی پھر بھی میں مسکرا دی۔ ڈیڈی کا تجربہ بہرحال مجھ سے زیادہ تھا۔

یہ بندھن بھی کتنا خوبصورت، مقدس اور عجیب ہوتا ہے۔ اس کے نام کی انگوٹھی ہاتھوں میں ڈالتے ہی دل اس کے نام پر دھڑکنے لگا تھا۔ کام کرتے ہوئے میں چوری چوری اسے دیکھتی تو وہ اپنے کام میں مصروف ہوتا۔ وہی پہلی سی بے نیازی کے ساتھ۔ کسی کام میں خرابی ہوتی تو ڈانٹ بھی دیتا۔ اور میرے دل میں کچھ ٹوٹ سا جاتا۔ لیکن پھر میں خود کو تسلی دے لیتی۔

"سکندر کو اپنے کام سے عشق ہے۔ سعد خان کہتے تھے کہ جب سکندر کوئی پراجیکٹ شروع کرتا ہے تو پھر خود کو اس میں گم کر لیتا ہے۔"

لیکن پھر بھی کبھی تو۔۔۔ کبھی تو اس نے کچھ کہا ہوتا۔ کوئی خوبصورت جملہ۔ کوئی پیار بھری نظر۔ فارغ لمحات بھی تو ہوتے تھے۔ کئی بار ہم نے سائیڈ پر اکیلے بیٹھ کر کافی پی۔ لیکن سکندر نے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی جیسے وہ یہ بندھن باندھ کر بھول گیا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان کیا رشتہ ہے۔

میں نے شادی کے لیے پندرہ دن کی چھٹی لی تو سب ہی مس مارتھا کے کمرے میں اکٹھے ہو کر مجھے وش کر رہے تھے۔

"سچ بتاؤ اوج! اتنے روکھے بندے کو کیسے پٹایا۔" مس مارتھا نے ہنس کر پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ میں نے تو نہیں۔۔۔" میری نظریں اندر آتے سکندر پر پڑیں تو نروس ہو کر میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"مس اوج نے نہیں، سکندر نے انہیں پٹایا ہو گا۔" ٹائپسٹ لڑکی فاخرہ نے جس کی پشت سکندر کی طرف تھی تبصرہ کیا۔

"حقیقت یہ ہے مس مارتھا کہ انہوں نے ہی مجھے پٹایا ہے۔"

سکندر کے ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی اور وہ شوخ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"کیسے؟" فاخرہ نے پوچھا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔" وہ معصومیت سے کہتا ہوا اسد ملک کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "بے خبری میں ہی لٹ گئے۔"

اس نے بہت گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور اس

www.allurdu.com

تھیں۔ سنہار تھا جو اکاؤنٹ آفس میں تھیں۔ سکندر نے مجھ سے کہا تھا کہ میں مس مارتھا کے آفس سے اس پراجیکٹ کی فائل لے کر سارا اسسٹنٹ تیار کرلوں۔۔۔۔ اور میں نے مجھے اسی وقت پتا چلا تھا کہ مسز مارتھا ریٹائر ہو رہی ہیں۔ اپنے ملک سے دور اس اجنبی ملک میں سب انہیں ریٹائر ہونے کی مبارکباد دے رہے تھے اور وہ بہت خوش لگ رہی تھیں۔ انہوں نے سب کے لیے کافی منگوائی تھی۔

"لو یہ کافی پی کر جاؤ۔" انہوں نے مجھے بھی روک لیا۔

یہاں کا ماحول بہت دوستانہ تھا۔ سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے اور اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے باس سعد خان ایک بہت شفیق اور دوست قسم کے انسان تھے۔ چند ہی دنوں میں میں بھی سب سے گھل مل گئی تھی۔ مجھے سنہار تھا کو انکار کرنا مناسب نہ لگا۔ اور میں یہاں کافی پینے بیٹھ گئی تھی اور پھر کافی پیتے ہوئے میں اسد ملک کی کسی دلچسپ بات پر ہنس رہی تھی کہ سکندر علوی اندر داخل ہوا۔

"مس لوئ! میں نے یہاں آپ کو کام سے بھیجا تھا۔ کافی پینے نہیں۔ آپ انتہائی غیر ذمہ دار ہیں۔"

وہ بہت غصے میں بول رہا تھا اور سنہار تھا اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں نے کافی کی تقریباً بھری ہوئی پیالی وہیں ٹیبل پر رکھ دی اور مسز مارتھا سے فائل لے کر باہر چلی گئی۔ مجھے سکندر کے غصے پر حیرت ہوئی تھی۔ لیکن میں کچھ کہے بنا باہر چلی گئی اور جب میں کمپیوٹر روم میں اسسٹنٹ تیار کر رہی تھی تو وہ وہاں چلا آیا۔

"میرا خیال ہے مس لوئ! آپ تھوڑا ریلیکس کر لیں۔ بلکہ بہتر یہی ہے کہ باقی کا کام کل کریں۔ ابھی پنسل اور سیاہی کے کچھ نئے رنگ آئے ہیں۔ میرا خیال ہے پہلے والے رنگوں کے مقابلے میں یہ زیادہ بہتر ہیں۔"

میں نے کمپیوٹر آف کر کے سکندر کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ دیر پہلے کے سکندر سے بہت مختلف لگ رہا تھا۔

"اگر آپ کو زیادہ جلدی نہ ہو تو ایک کپ کافی ہو جائے۔۔۔ پلیز۔" وہ جانے کے لیے پلٹا۔

"مس مارتھا کے کمرے میں تو جائے گا۔"

"یہ سکندر علوی کیا چیز ہے؟" اس شام میں نے اسد ملک سے پوچھا تھا۔

میری گاڑی ورکشاپ گئی ہوئی تھی اور اسد ملک نے مجھے گھر تک پہنچانے کی آفر کی تھی۔ اور میں نے کسی ویگن میں دھکے کھانے، یا کسی ٹیکسی میں تنہا جانے سے بہتر یہی سمجھا کہ اسد ملک کی آفر قبول کر لوں۔

"سکندر ایک بہت پیارا بندہ ہے مس لوئ! دراصل اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ بالکل اکیلا ہے۔ والدین کا اس کے بچپن میں انتقال ہو گیا تھا اور اس طرح اکیلے پلنے والے بچے خودرو پودوں کی طرح بڑھتے ہیں۔ ان کی کانٹ چھانٹ نہیں ہوتی اس لیے ان کی شخصیت میں بعض اوقات کئی خلا پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ سکندر کی شخصیت ایسی نہیں ہے۔ بس وہ غصے کا تیز ہے۔ ذرا سی غلطی اس سے برداشت نہیں ہوتی۔ وہ بہت ایکٹو ہے۔"

مجھے اسد ملک کی بات سے اتفاق تھا۔ تو بہت بعد میں جا کر مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ صرف غصے کا ہی تیز نہیں ہے بلکہ اس کی شخصیت میں کئی نفسیاتی گرہیں ہیں۔ وہ کسی کو بے بس اور حقیر و لاچار جان کر خوشی محسوس کرتا ہے۔ ایسے میں کئی بار میں نے اس کے چہرے پر سکون اترتے دیکھا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں کے پانیوں میں اضطراب سا پیدا ہوتا۔ ہلچل سی مچتی تھی لیکن بس کچھ دیر کے لیے۔۔۔۔ اس ہلچل میں ایک نامعلوم سی خوشی اور مسرت ہلکورے کھاتی دکھائی دیتی تھی اور پھر وہی جادو ستا تاثر اور نامعلوم سا حزن ان آنکھوں میں اتر آتا۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ میں نے کئی بار سوچا تھا۔

ایک بار سائٹ سے واپس آتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ بلکہ اسے مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ اپنا آپ کھول دے۔ اپنے

دکھ سکھ کسی کے ساتھ شیئر کرلے۔ تب اس نے مجھے ڈانٹ دیا تھا۔

میں ہولے ہولے اس کے مزاج کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ اور میں نے اس کے متعلق زیادہ سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ جیسا بھی ہے مجھے کیا۔ ہر آدمی کی اپنی طبیعت ہوتی ہے۔ مجھے اس کے ساتھ کام کرنا ہے سو مجھے اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ البتہ میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ آئندہ میں اس کے ساتھ کسی پراجیکٹ پر کام نہیں کروں گی۔ نہ ہی اسے اسسٹ کروں گی۔۔۔۔ اور یہ بات میں نے سعد خان سے بھی کہہ دی تھی۔ اور وہ مسکرا دیے تھے۔

"ٹھیک ہے مس لوئ! ایز یو وش۔"

لیکن تب مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ پراجیکٹ ختم ہونے سے پہلے ہی یہ شخص مجھے اپنا اسیر کرلے گا۔ جب ڈیڈی نے مجھے بلا کر سکندر علوی کے متعلق پوچھا۔ تب بھی میرے وہم و گمان تک میں نہیں تھا۔ کہ اس نے مجھے پروپوز کیا ہے اور ڈیڈی کی انویسٹی گیشن اس سلسلے میں ہے۔

"ڈیڈی! آپ سکندر کو جانتے ہیں؟" مجھے حیرت ہوئی تھی۔

"جی بیٹا! میں اس سے مل چکا ہوں۔"

"تو پھر آپ اس کے متعلق کیا جاننا چاہتے ہیں؟"

"تم بھی کہو کیسا ہے۔ کس طرح کا ہے۔"

"بہت ذہین ہے۔ بلکہ جینئس کہہ لیں لیکن اس کے مزاج کے متعلق کچھ پتہ نہیں چلتا۔"

میں نے بہت صاف گوئی سے وہ سب کچھ جو میں اس کے متعلق سوچتی اور محسوس کرتی تھی کہہ دیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ ڈیڈی کچھ خاموش سے ہو کر سوچنے لگے ہیں۔

"آپ کا کیا خیال ہے بیٹا! اگر اس طرح کے مزاج کے شخص میں حالات کے بدلنے سے تبدیلی آ سکتی ہے؟"

کچھ دیر بعد انہوں نے پوچھا۔

"شاید۔" میں کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی۔

موٹاپے سے نجات

کہا جاتا ہے کہ ہر بیماری کی جڑ پیٹ کی خرابی ہے'
موٹاپا اور پیٹ کا بڑھ جانا خواتین کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے
اسی طرح چہرے پر مہاسے 'کیل مہاسیاں بھی پیٹ کی خرابی سے ہوتی ہیں۔
خواتین کے ان تمام مسائل کا حل
نایاب جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ

جوہر ہاضم

- موٹاپا ختم
- بڑھا ہوا پیٹ اندر
- داغ دھبے اور کیل مہاسے غائب
- گیس معدے کی گرانی کا خاتمہ
- قیمت صرف /50 روپے

پتہ ذیل سے منگوائیں۔
عبدالمالک ساجدہ کارنر نمبر 10
نزد ماشاء اللہ ملک شاپ ٹریکس روڈ کراچی

www.allurdu.com

کی نظروں کی حدت سے میرے رخسار جل اٹھے اور پلکیں اٹھانا مشکل ہو گیا۔

"سکندر علوی! اگر آج سے اٹھارہ سال پہلے تم ملے ہوتے تو کہیں نہ جانے دیتی تمہیں سوئٹ بوائے۔" مسز ہارتھا ہنسیں۔

"ابھی ہمیں تو جن کا گرفتار رہنا تھا ان ہی کا بننا تھا۔ جاب اٹھارہ سال پہلے چاہے اب۔"

اس کی نظریں اب بھی میرے چہرے پر تھیں۔ والہانہ نظریں۔ جو دل کے اندر اترتی ہوئی۔

"تم بہت کی ہو اورج۔"

مسز ہارتھا نے رشک بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور مجھے لگا میں واقعی دنیا کی خوش قسمت ترین عورت ہوں جسے سکندر جیسے شخص کا ساتھ ملا ہے۔

"کیا میں نہیں؟" وہ مسز ہارتھا کے سامنے جھک کا پوچھ رہا تھا۔

"تم بھی شریر لڑکے۔"

"بائے دا وے یہ رش کس سلسلے میں ہے۔ کیا مسز ہارتھا کافی بلوا رہی ہیں؟"

اس نے پوچھا تب اسے بتانے لگے کہ آج میں شادی کے لیے چھٹی پر جا رہی ہوں۔

"چھٹی پر جا رہی ہیں اور مجھے اسسٹ کون کرے گا۔"

"میں۔" اسد ملک نے جواب دیا۔

"جی نہیں، تم چھٹیاں بہت کرتے ہو بھگوڑے۔"

"اچھا ای سوزا کرے گا۔"

"جی نہیں۔" وہ خوامخواہ مچل رہا تھا اور شوخ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا..... اس روز اس کا رویہ دیکھ کر میں نے سوچا تھا شاید وہ اپنی ذات کے خول سے باہر آ رہا ہے اور اس کے ساتھ زندگی بے حد خوبصورت ہوگی۔ ہلکی پھلکی اور مسرتوں سے بھری۔ اس روز اس نے مجھے "آفر" کی تھی چونکہ وہ بھی گھر جا رہا ہے لہٰذا مجھے ڈراپ کر دے گا۔

منگنی کے بعد پہلی بار اس کا یہ التفات مجھے پاگل کیے دے رہا تھا۔

"اورج!" راستے میں اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "شادی کی ساری شاپنگ بھابھی اور اسد بھائی ہی کر رہے ہیں۔ مجھے اس کا کچھ تجربہ نہیں ہے۔ میں نے بھابھی سے کہا تھا کہ وہ آپ سے بھی مشورہ کر لیں۔ پھر بھی آپ اپنی پسند سے کچھ لینا چاہیں تو۔"

اس نے ایک بڑی رقم کا چیک مجھے دیا۔ میں نے انکار کیا تو اس نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"پلیز اورج! انکار مت کیجیے۔ فی الحال میں فلیٹ میں رہتا ہوں جو بھی کرائے کا ہے لیکن جلدی آپ کے آنے کے بعد میں اپنا گھر لے لوں گا۔"

پہلی بار اپنے حوالے سے اس نے یہ بات کی تھی۔ پھر ذرا سا مسکرایا تھا۔

"اورج! میں کچھ کھردرا سا بندہ ہوں۔ شاید بد مزاج بھی۔ پھر بھی آپ نے میرا پرپوزل ٹھکرایا نہیں۔ اس کے لیے کیا شکریہ ادا کروں۔"

میں خاموش ہی رہی بھلا کیا کہتی۔ لیکن رخساروں پر شفق اتر آئی تھی۔

"بہرحال اب تو جیسا بھی ہوں، آپ قبول کر چکی ہیں اور امید ہے اپنی ریشم رفاقتوں سے میرے کھردرے پن کا بھرم رکھ لیں گی۔"

اور تب میں نے سوچا تھا کہ میں سکندر کی زندگی کے ورق ورق سے وہ داستان الم کھرچ ڈالوں گی۔ جس نے سکندر کو یوں کرخت بنا دیا ہے۔ ڈیڈی سچ کہتے ہیں کہ سکندر اندر سے بہت نرم دل ہے۔

رخصتی سے پہلے میں نے ڈیڈی سے کہا تھا۔

"ڈیڈی! آپ میرے لیے پریشان مت ہوئیے گا۔ سکندر ایک بہترین انسان ہے اور اس کی رفاقت میرے لیے باعث فخر۔ ڈیڈی! آنکھیں اسے مزید بھگونے نہیں دوں گی۔"

شاید یہ غلط تھا..... مجھے لگا میرے ساتھ نے اسے اور بکھیر دیا ہے۔ اس نے اپنے گرد نفرت اور اجنبیت کی دیواریں کھڑی کر لی ہیں۔ شاید اسے مجھ سے محبت نہیں تھی۔ رفاقتیں محبتوں کو جنم دیتی ہیں لیکن اسے مجھ سے محبت نہ ہو سکی۔ میں نے اس سے

کبھی گلہ نہیں کیا۔ محبت تو خود بخود کسی دل میں جنم لیتی ہے اور کسی دل پر جبر نہیں کیا جا سکتا لیکن مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی۔ بہت شدید اور گہری محبت میں نے ہوش سے پہلے اس سے شادی کرنے سے انکار کیا تھا۔ اب اس کی زندگی میں شامل ہونے کے بعد مجھے یوں لگنے لگا تھا کہ وہی ایک شخص میری زندگی کا حاصل ہے۔ اور اگر وہ نہ ہوتا تو اس کے بغیر زندگی بے معنی اور بیکار تھی۔

میں بہت زیادہ خوبصورت نہ تھی لیکن سب ہی کہتے تھے کہ میں بہت پرکشش اور دلکش ہوں۔ اور عروسی لباس میں تو میں خود اپنے آپ کو دیکھ کر ایک لمحہ کو ششدر رہ گئی تھی۔ کیا یہ میں ہوں۔ میں نے بہت حیرت سے خود سے پوچھا تھا۔ میری کزنز مجھ سے مذاق کر رہی تھیں مجھے چھیڑ رہی تھیں اور میرے کانوں میں نہ جانے کیا کیا سرگوشیاں کر رہی تھیں لیکن سکندر نے بس ایک نظر مجھے دیکھا تھا۔ ایک لمحہ کو مجھے اس کی آنکھوں میں ستائش نظر آئی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ نارمل سا مجھ سے اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے ہم آفس میں بیٹھے ہوں۔

"ویسے تم آج بہت دلکش لگ رہی ہو اورج! بالکل مختلف۔ ایک لمحہ کو تو میں تمہیں پہچان ہی نہ سکا۔"

مجھے رونمائی میں لاکٹ دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جذبوں کی چمک نظر آئی تھی۔ میں شرما گئی۔ تو اس کے ہونٹوں پر دلکش سی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی۔

"اورج! تم مجھ سے شادی کر کے خوش ہو؟"

میں نے سر جھکا دیا۔ لیکن میرے چہرے پر پھیلتے خوشی کے رنگ چھپ نہ سکے۔

"پتا نہیں میں تمہیں خوش رکھ سکوں گا یا نہیں۔" اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا تھا۔

میں نے آنکھیں اٹھا کر حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"اورج! میں..... مجھے پتا نہیں کہ کسی کو خوش کیسے رکھتے ہیں کیونکہ مجھے بھی کسی نے خوش نہیں رکھا۔"

"نہیں..... میں آپ کو بتاؤں گی سکندر کہ خوشی کیا ہوتی ہے..... ہم دونوں مل کر ایک خوش کن زندگی کا آغاز کریں گے۔"

میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا تھا اور اس سے میں نے اپنے دل میں سکندر کے لیے بہت انوکھی سی محبت محسوس کی تھی..... مجھے لگا تھا جیسے بظاہر درشت دکھنے والا سکندر اندر سے بہت بکھرا اور ٹوٹا ہوا ہے۔ اور اس سے میں نے اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ میں سکندر سے اتنی محبت کروں گی کہ وہ اپنی ساری محرومیاں بھول جائے گا۔

لیکن اس کے زخموں پر مرہم رکھتے رکھتے میرے اپنے ہاتھ زخمی ہو گئے۔ اس کی محرومیاں دور کرتے کرتے میں خود بہت ساری محبتوں سے محروم ہو گئی۔

اس نے جو چاہا میں نے کیا.....

اس نے چاہا کہ میں جاب چھوڑ دوں۔ میں نے جاب چھوڑ دی۔

اس نے کہا میں بھاگ بھاگ کر میکے نہ جایا کروں۔

میں نے میکے جانا چھوڑ دیا۔

اس نے کہا دوستوں سے نہ ملوں۔

میں نے کہا ٹھیک ہے۔

دل میں ایک امید تھی کہ میری یہ قربانیاں رنگ لائیں گی۔

شاید ایک روز وہ اپنی ذات کے حصار سے باہر نکل آئے اک روز وہ میری محبتوں اور خدمتوں کا اعتراف کرے لیکن ایسا ہوا نہیں۔ محبت سے بات کرتے کرتے وہ یک دم درشت ہو جاتا۔

شاید وہ اپنی ذات کا حصار توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید وہ اپنے خول سے باہر آتے ڈرتا تھا۔ اس نے کبھی مجھ سے اپنا ماضی شیئر نہیں کیا۔

تب میں نے اپنے ماضی کو دہرانا شروع کر دیا۔ کہ شاید کبھی وہ بھی اپنے ماضی کا ذکر کرے۔ یونہی ایک دن ڈنر لیتے ہوئے۔ کھانے کی میز پر یا بیڈ روم میں کوئی نہ کوئی اپنے بچپن کی بات چھیڑ دیتی۔ شروع میں ایک دو

دن اس نے دلچسپی سے میری بات سنی۔۔۔ لیکن پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے بچپن کی باتوں سے چڑ سا جاتا ہے۔ بلا وجہ کا غصہ۔

کبھی کوئی پلیٹ اٹھا کر پٹخ دی اور کبھی کچھ۔۔۔ میں حیران ہوتی کہ وہ اس طرح کیوں کرتا ہے۔ تب ایک روز وہ پھٹ پڑا۔

"آخر تم مجھ پر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو اوج شیر کہ تمہارا بچپن بہت خوبصورت تھا اور اب زندگی تمہارے لیے اتنی خوبصورت نہیں ہے۔"

"نہیں ایسا تو نہیں سکندر۔۔۔! ہر عمر کے اپنے تقاضے اور اپنا حسن ہوتا ہے۔ میرا بچپن' میرا لڑکپن' میری جوانی سب ہی خوبصورت ہے۔۔۔ اور یہ جو اب تمہاری رفاقت میں گزر رہے ہیں' وہ تو زندگی کا حاصل ہیں' سب سے خوبصورت ہیں۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو اوج!" اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔

"نہیں بھلا اس میں جھوٹ کی کیا بات ہے۔ تم ایک اسمارٹ' پڑھے لکھے باروزگار شخص ہو۔ اس کے علاوہ ایک عورت کو کیا چاہیے ہوتا ہے؟"

میں نے آہستگی سے کہا تو اس کی آنکھوں میں نرم سا تاثر ابھرا۔

"میں تو بچپن کی باتیں اس لیے کرتی ہوں کہ تم کبھی اپنا بچپن بھی نہیں بھولتے۔ تمہارا بچپن بھی تو ایسا ہی ہو گا۔"

"نہیں تھا میرا بچپن ایسا" یکدم ہی اس کی آنکھوں کا وہ نرم تاثر غائب ہو گیا اور وہاں عجیب سی درشتی جھلکنے لگی وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا۔ وہ ی روم سے باہر نکل گیا۔

شاید اس کے بچپن سے کوئی خوبصورت یاد وابستہ نہ تھی لیکن دکھ ہی سہی۔۔۔ وہ شیئر کرلیتا لیکن وہ اپنے حوالے سے کبھی کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ جیلس ہوتا ہے شاید اس کے ذہن میں خیال آتا ہو کہ اس کا بچپن اتنا اچھا کیوں نہیں تھا۔ تب میں نے اپنے بچپن اور لڑکپن کی باتیں کرنا چھوڑ دیں۔ میں اسے خوش دیکھنا چاہتی تھی' کیونکہ میں اس سے محبت کرتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے خود پر حیرت ہوتی کہ میں اوج کمال' سکندر علوی سے شدید محبت کرنے لگی ہوں؟ اتنی شدید کہ ذرا اسے دیر ہو جاتی تو بے چین ہو جاتی۔ آفس فون کرتی اور جب تک وہ گھر نہ آجاتا۔ بے پاؤں کی بلی کی طرح سارے گھر میں چکراتی پھرتی۔ شاید یہ محبت اس رشتے کی وجہ سے خود بخود دل میں اتر آئی تھی جو میرے اور اس کے درمیان تھا۔ لیکن اس مقدس رشتے نے اس کے دل میں میرے لیے محبت بیدار نہ کی تھی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا جیسے وہ مجھے چاہتا ہے۔ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اس کی والہانہ نظریں اس کی وارفتگی۔۔۔ اس کے خوبصورت جملے۔

لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی نظریں بدل جاتیں۔ خوبصورت جملوں کی جگہ اس کی زبان پر کانٹے اگ آتے۔ وہ مجھے ناخوش کر کے خوش ہوتا۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے کونوں پر تھرتھراتی۔

"کیا وہ کوئی نفسیاتی مریض ہے؟" ایک بار میں نے سوچا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس روز ہم اسد ملک کے ہاں سے ڈنر کر کے لوٹے تھے۔ اسد کے بیٹے کی برتھ ڈے تھی اور انہوں نے ہمیں ڈنر پر انوائیٹ کیا تھا۔ اس روز میں نے سیاہ ساڑھی باندھی تھی جس کے بارڈر پر سنہری ستاروں کا جال سا بنا تھا اور اسد ملک کی بیوی نے کہا تھا کہ میں آج غضب ڈھا رہی ہوں۔

میں نے بلیک اسٹون کے جھمکے سے نیکلس اور رنگ بی والا پہن رکھی تھی اور بلیک ہی کانچ کی چوڑیاں بھی تھیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے بچپن سے ہی سونے کے مقابلے میں کانچ کی چوڑیاں پسند تھیں۔ راستے میں ڈرائیو کرتے ہوئے کئی بار سکندر نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا' اس کی آنکھوں میں واضح ستائش تھی۔ اور پھر اس نے ایک جگہ گاڑی روک کر پھول بیچنے والے لڑکے سے پھول خریدتے ہوئے میری

www.allurdu.com

طرف مسکرا کر دیکھا تھا۔

"آج بہت پیاری لگ رہی ہو' سوہا ان کلائیوں میں چوڑیاں بج کر تمہیں اور دلکش بنا دیں گے۔" اور پھر اپنے ہاتھوں سے میری کلائیوں میں گجرے پہناتے ہوئے وہ کچھ ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

"ایک بار حمید اللہ علوی نے افزا علوی کے لیے گجرے خریدے تھے اور......"

وہ جیسے خواب کے سے عالم میں بولا تھا اور اس نے اپنے ہاتھ میری کلائیوں سے ہٹا لیے۔ میں بہت دھیان سے اسے سن رہی تھی۔ شاید آج وہ مجھے کہ جب وہ اپنے متعلق کچھ بتانے لگا ہے۔ پتا نہیں یہ افزا علوی اور حمید اللہ علوی کون ہیں۔ میں نے سوچا لیکن وہ پھر اپنے خول میں سمٹ گیا اور اپنی ذات کے گرد وہی دیواریں کھڑی کر لیں اور ہونٹ بھینچ لیے۔ مجھے لگا جیسے اس کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی ہوں۔ میں کتنے ہی لمحے منتظر رہی کہ شاید وہ کچھ بولے لیکن وہ خاموشی سے ہونٹ بھینچے ڈرائیو کرتا رہا۔ گاڑی جب گھر والی سڑک پر مڑی تو میں نے پوچھا۔

"سکندر! کیا ہم گھر جا رہے ہیں؟"

"ہاں۔"

"مگر تم نے تو کہا تھا لمبی ڈرائیو پر جائیں گے اور......"

"تھک ماری تھی' جھوٹ بولا تھا۔" وہ یکدم مجھ پر الٹ پڑا۔

"تمہارا دل چاہ رہا ہے تو چلی جاؤ اکیلی۔"

اور میں ششدر سی اسے دیکھتی رہی...... اور میرے آنسو اندر ہی اندر میرے دل پر گرنے لگے۔ ابھی چند لمحے پہلے اس کی آنکھوں میں کتنے رنگ تھے کتنی حدت تھی۔ یہی محبت تھی کاش یہ لمحے وہیں کہیں ٹھہر جاتے اور میں ہمیشہ ان جذبے لٹاتی آنکھوں کو خود پر نثار ہوتے دیکھتی رہتی اور یہ کوئی ایک بار کی تو بات نہ تھی کئی بار ایسا ہوا تھا کہ مجھے لگا جیسے میری ریاضتوں کا ثمر مل گیا ہو' لیکن دوسرے ہی لمحے میں پھر اسی جگہ پر پہنچ جاتی جہاں سے میرا سفر شروع ہوا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس روز وہ بہت خوش خوش گھر آیا تھا۔

"صوفی جے...... اوئے! جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ آج ہم ڈنر باہر کریں گے اور میں تمہیں ایک سرپرائز دوں گا۔"

"کیا بات ہے بہت خوش لگ رہے ہو۔"

"خوش تو ہوں۔" وہ مسکرایا۔ مسکراہٹ اس کے چہرے پر کتنی بھلی لگتی تھی۔ میں کتنی ہی دیر اس کے چہرے کو تکتی رہی۔

"کیا نظر لگانے کا ارادہ ہے؟" میں جھینپ گئی اور میں نے نظریں جھکا لیں۔

"اچھا سا ڈریس پہن لو۔"

میرے اندر جیسے پھول کھلنے اور چٹکنے لگے۔ میں فوراً ہی تیار ہونے چل دی۔ اور جب تیار ہو کر آئی تو وہ خود بھی سیاہ ڈنر سوٹ میں تیار کھڑا تھا۔

"صوفی!" اس نے ایک ستائشی نظر مجھ پر ڈالی۔ "آج کے دن تمہیں اتنا ہی خوبصورت نظر آنا چاہیے جتنا آ رہی ہو۔"

"مگر آج کے دن کیا ہے؟" اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں نے پوچھا تو وہ مسکرا دیا۔

اور پھر کچھ دیر بعد ہی مجھے پتا چل گیا کہ آج میرا برتھ ڈے تھا اور مجھے یاد تک نہ تھا۔ سکندر کی ذات نے مجھے اس طرح الجھایا تھا کہ مجھے اپنا برتھ ڈے بھی یاد نہ رہا تھا۔ حالانکہ شادی سے پہلے میں دو تین دن پہلے ہی شور مچانا شروع کر دیتی تھی کہ میری برتھ ڈے آ رہی ہے لہٰذا اب میرے لیے گفٹ خرید لیں اور اب میں ہوٹل میں سجی سجائی ٹیبل کے گرد عجیب سے خوبصورت احساسات میں گھری بیٹھی تھی' جب سکندر نے جھک کر سرگوشی کی۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو!" اس کی آنکھوں میں جگنو سے دمک رہے تھے۔

"تھینک یو سکندر!" شدت جذبات سے میری آواز بھرا گئی۔

"کیا گفٹ لو گی؟" وہ بدستور تھوڑا سا میری طرف جھکا تھا۔

"آپ کو یہ دن یاد رہا' آپ نے اسے سیلیبریٹ کیا' اور یہ خوبصورت پھول۔"

میں نے ٹیبل پر پڑے خوبصورت بکے کی طرف اشارہ کیا۔

"اس سے بڑھ کر اور کیا گفٹ ہو سکتا ہے۔"

"کیا خبر کوئی ہو۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

پھر ہم دونوں نے ایک ساتھ پھونک مار کر موم بتی بجھائی' یہ میری ازدواجی زندگی کا حسین ترین دن تھا۔ ہم ڈنر کر کے جب باہر نکلے تو سکندر کے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھا اس کی گرم جوش گرفت سے میرے رگ و پے میں بجلیاں دوڑ رہی تھیں اور اسی لمحے اس کے ساتھ چلتے چلتے میں نے تا عمر اس کی رفاقت میں یونہی چلتے رہنے کی آرزو کی۔

اس روز سکندر مجھے ایک قطعی بدلا ہوا شخص لگ رہا تھا۔ قدرے شوخ اور کھلنڈرا سا۔

"کیا اب ہم گھر جا رہے ہیں؟"

میں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مگر یہ راستہ گھر کی طرف تو نہیں جاتا۔"

"کیا خبر گھر کی طرف ہی جاتا ہو۔" اس نے بے حد شوخ نظروں سے مجھے دیکھا اور میں سمجھ نہ سکی کہ اس میں کیا اسرار ہے اور جب ایک خوبصورت گھر کے سیاہ گیٹ میں لگے ہوئے لاک کو سکندر نے کھولا تب بھی مجھے خبر نہ تھی بلکہ گمان تک نہ تھا کہ یہ گھر سکندر کا ہے۔

"کیسا ہے یہ گھر؟" سکندر نے مجھے سارا گھر دکھایا۔

"بہت خوبصورت۔" میں نے تعریف کی۔

"کیا آپ فلیٹ چھوڑنے کا ارادہ کر چکے ہیں اور ہم لوگ اب یہاں شفٹ ہوں گے۔"

میرے لہجے میں بے حد خوشی تھی۔ مجھے فلیٹ پسند نہیں ہے۔ کبھی بھی وہاں مجھے گھٹن ہوتی ہے۔ ہمیشہ سے مجھے بڑے اور کھلے گھر پسند ہیں۔ خوبصورت لان ہو جس میں پھول لہلہا رہے ہوں۔

"یہ گھر۔" اس نے پاکٹ سے چابی نکال کر مجھے دی۔ "تمہارا ہے...... تمہارا برتھ ڈے گفٹ۔"

اس نے ہاتھ میں پکڑا براؤن لفافہ میری طرف بڑھایا۔

"یہ گھر میں نے تمہارے نام سے خریدا ہے۔ کچھ کارروائی باقی ہے اسے کل مکمل کر لیں گے۔" میں ساکت کھڑی تھی۔

"یار...... لو اور یقین کر لو یہ گھر تمہارا ہے۔ اب کل سے ادھر شفٹ ہو جائیں گے۔ ایک بار تم نے کہا تھا کہ تمہیں فلیٹوں کی زندگی پسند نہیں ہے۔"

اور اسے میری بات یاد تھی' جبکہ میں سمجھتی تھی کہ اس نے کبھی دھیان سے مجھے نہیں سنا۔

"میں جب چھوٹا تھا تو ہر روز سونے سے پہلے اپنے دل میں عہد کرتا تھا کہ جب بڑا ہوں گا تو افزا علوی کے لیے ایک بڑا سا گھر خریدوں گا۔" وہ جیسے کہیں ماضی میں جھانک رہا تھا۔

اور پھر......

یکایک وہ چونکا جیسے خواب سے جاگا ہو اور پھر پہلے کی طرح اس نے اپنی ذات کے دریچے بند کر لیے۔ جانے کیوں وہ خود کو چھپائے رکھنا چاہتا تھا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ یکایک اس کی آنکھوں کی چمک بجھ گئی تھی اور اس کے لہجے میں جو خوشی کچھ دیر پہلے کھنک رہی تھی وہ مر گئی تھی۔ وہ کچھ کھو سا گیا تھا۔

"سکندر!" میں نے اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

"تھینک یو سکندر! لیکن تم یہ کچھ کہتے کہتے رک کیوں جاتے ہو...... میں تمہاری دوست ہوں سکندر! صرف بیوی نہیں...... تم بھی تو اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ دو...... یقین کرو سکندر! میں تمہارے دل میں چبھے سارے کانٹے چن لوں گی۔ سب دکھ لے لوں گی۔"

"کون سے دکھ؟ کون سے کانٹے لو گی؟ تم کیا سمجھتی ہو کہ دنیا میں صرف واحد تم ہی خوش قسمت ہو۔ تم نے ہی خوشیوں کے پھول چنے ہیں۔ باقی سب کا دامن

www.allurdu.com

کانوں سے بھرا ہے۔"

پل کے پل میں اس کی آنکھوں میں تکدر کے بادل اتر آئے تھے جیسے میں ہر تکتی ہی تھی۔ اور پیشانی پر بل پڑ گئے تھے اور اس رات واپس آتے ہوئے مجھے ایسی ایسی باتیں کہی تھیں کہ میں ساری رات روتی رہی تھی۔ آخر خوشی مجھے کیوں راس نہیں آئی تھی۔

کیا صرف چند لمحوں کی مسرت کی قیمت ساری رات بہنے والے آنسو تھے۔

صبح اٹھی تو میرا سر بھاری ہو رہا تھا اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو قریب ہی سے اس کی نرم آواز سنائی دی۔

"لیٹی رہو اوہ! غالباً تمہارے سر میں درد ہے۔ میں نے ناشتہ بنا لیا ہے اور تمہارے لیے چائے دم کر کے رکھ دی ہے۔"

میں نے ذرا سا رخ موڑ کر دیکھا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا اور قریب ہی سائیڈ ٹیبل پر چائے کا تھرموس پڑا تھا۔ اس کی شخصیت کا یہ تضاد مجھے پاگل کیے دے رہا تھا۔ میرا جی چاہا میں چیخیں مار مار کر رونے لگوں۔ لیکن میں آنکھیں میچے چپ چاپ لیٹی رہی۔

زندگی کا سفر کتنا مشکل تھا۔ میں ہمت ہارنے لگتی تو ڈیڈی آنکھوں ہی آنکھوں میں ہمت بڑھاتے۔ نئے گھر میں شفٹ ہونے کی خوشی میں سکندر نے سب کو دعوت دی۔ اس روز آفس سے بھی سب ہی لوگ آئے تھے۔ اتنے سارے دنوں بعد میں سب سے ملی تھی لیکن پھر بھی میرے اندر کی اداسی ڈیڈی سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔

"کیا بات ہے بیٹا؟"

انہوں نے بہت آہستگی سے مجھ سے اسی وقت آکر پوچھا جب میں کچن میں چائے کا کہنے آئی تھی۔

"کچھ نہیں ڈیڈی!" میں نے مسکرانا چاہا تھا لیکن نہیں کیوں پلکیں نم ہو گئی تھیں۔

"کیا سکندر سے کوئی شکایت ہے؟"

ان کی آنکھوں میں یک دم تشویش نظر آنے لگی۔

"ڈیڈی! میں ابھی تک سکندر کو سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔"

"بہت ہار گئی ہو۔ تم تو ہر چیلنج کو قبول کر لیتی تھیں۔"

وہ کچھ پریشان سے تھے لیکن مجھے حوصلہ دے رہے تھے۔

"سکندر میرے لیے چیلنج نہیں ہے۔ میرا شوہر ہے۔ مجھے صرف اسے ہرانا تو نہیں ہے۔ مجھے تو اس کی محبت کی ضرورت ہے۔ ایک پل میں وہ محبت ہی محبت دیتا ہے اور دوسرے پل نفرت ہی نفرت۔ اس کے ساتھ کیا پرابلم ہے میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔ اس نے اپنی ذات کے سارے دروازے بند کر رکھے ہیں۔"

"کہیں تو کوئی روزن ہوگا۔ جس سے اس کے اندر جھانک سکو۔" ڈیڈی بالکل دوستانہ انداز میں بات کر رہے تھے۔

"کہیں کوئی روزن نہیں ہے ڈیڈی! ابھی کہیں کوئی روزن دکھائی بھی دیتا ہے تو وہ اسے فوراً بند کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے جیسے اس کا ماضی ـــــ"

"نہیں۔" میری بات سمجھ کر ڈیڈی نے مجھے ٹوک دیا۔ "وہ شریف ماں باپ کا بیٹا ہے۔ میں اس کے والدین کو جانتا ہوں شاید میں نے تمہیں بتایا تھا پہلے بھی۔"

"پتا نہیں شاید بتایا ہو' لیکن آپ کیسے جانتے ہیں؟"

"میرا تعلق اسی شہر سے ہے جہاں کا سکندر ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ والدین کی وفات کے بعد سوتیلے بہن بھائیوں کے سلوک نے اسے ایسا کر دیا ہے۔ تم اپنی محبتوں سے اس کو بدل دو۔"

اور میں ایک نئے سرے سے ہمت باندھ کر اس کے ساتھ چلنے کی کوشش کرنے لگی۔

♥ ♡ ♡ ♥

ان دنوں بلال باہر سے اپنی تعلیم مکمل کر کے آیا ہوا تھا ــــ اور ممی چاہتی تھیں کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ بلال میرا سگا بھائی نہیں ہے۔

لیکن اس نے سگے بھائیوں کی طرح ہی چاہا ہے مجھے اور سگی بہنوں کی طرح میرے لاڈ اٹھائے ہیں۔ سکول کی عمر تک تو مجھے پتا بھی نہیں تھا کہ بلال میرا ماموں زاد ہے جسے ممی نے بچپن میں ہی لے لیا تھا۔ ہم نے ایک ہی گھر میں سگے بہن بھائیوں کی طرح پرورش پائی ہے۔ وہ اتنے سالوں بعد آیا تھا۔ میری شادی بھی اس کی عدم موجودگی میں ہو گئی تھی۔ وہ میرا دوستوں جیسا بھائی تھا۔ سو میرا جی چاہتا تھا کہ میں ہر روز ہی اس سے ملنے جاؤں لیکن مجھے پتا تھا کہ سکندر کو یہ پسند نہ آئے گا لیکن میں نہ جاتی تو وہ خود چلا آتا۔ مگر سکندر کو اس کا آنا بھی پسند نہ تھا۔ وہ اس کے آنے پر چڑ جاتا اور مجھے ڈیڈی کے گھر ہی چلے جانے کے مشورے دیتا اور میری بے بسی پر محظوظ ہوتا۔ بلال بچوں کے لیے کھلونے اور بچوں کے استعمال کی کئی چیزیں لایا تھا میرے اور سکندر کے گفٹ کے علاوہ۔

"یار! میں نے تو سوچا تھا کہ اب تک کوئی بچوں بچوں آ گیا ہوگا اور تم اسے میری گود میں دیتے ہوئے کہو گی۔ یہ تمہارے ماموں جان ہیں۔"

اور اب اپنے گفٹ دکھاتے ہوئے میں نے بلال کی یہ بات سکندر کو بتائی تو اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا۔

"ہمیں ضرورت نہیں کسی "جیبیروں بچوں" کی۔"

"کیوں ضرورت نہیں سکندر! بچے تو زندگی کا حسن ہوتے ہیں۔"

"ہوتے ہوں گے حسن۔" اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ "لیکن مجھے اس حسن کو دنیا کی ٹھوکروں میں نہیں چھوڑنا۔ سن لیا تم نے' یہ خواہش اپنے دل سے نکال دو۔ تم چاہتی ہو کہ میں مر جاؤں اور میرے بعد تم بھی افرا علوی کی طرح اسے چھوڑ کر چل دو۔ نہیں ہرگز نہیں۔"

میرے دل میں جیسے اس نے بھالا مار دیا ہو۔ پھر بھی میں نے ضبط کیا۔

"سکندر!" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔ "میں اکلوتی تھی' تم بھی اکلوتے ہو۔ میں نے تو سوچا تھا ہمارے ڈھیر سارے بچے ہوں گے۔"

"شٹ!" اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "تمہارے ڈھیر سارے تو کیا ایک بچہ بھی نہیں ہوگا۔"

اور مجھے لگا کہ جیسے آج سے پہلے کبھی سخت اور تکلیف دہ بات سکندر نے کبھی نہ کی تھی اور یہ افرا علوی جانے کون تھی۔ میرے اندر شک کا کانٹا اگ آیا۔ آج تیسری بار اس نے یہ نام لیا تھا۔

"یہ افرا علوی کون ہے سکندر؟"

میں نے دل پر ضبط کے پہرے بٹھاتے ہوئے پوچھا۔ مگر وہ غصے سے مجھے گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔ جیسے وہ مجھے کبھی کچھ نہ بتائے گا۔ عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے ہر ظلم لیکن اسے اولاد سے محروم کر دیا جائے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ میں سمجھتی تھی کہ اگر ابھی تک میری اولاد نہیں ہوئی تو شاید خدا کی مصلحت ہے ابھی میری شادی کو بہت زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا تھا کہ میں مایوس ہو جاتی لیکن یہ جان کر کہ سکندر مجھے دانستہ اس خوشی سے محروم رکھ رہا ہے میرا دل خون کے آنسو رو دیا لیکن میں نے پھر بھی صبر کیا اور کوشش کرتی رہی کہ وہ بند دروازے کھول دے اور اپنی ذات کے اسرار ظاہر کر دے لیکن ایسا نہ ہو سکا ایک روز اس نے جو کہا اس نے مجھے ہرا دیا۔

اس روز بلال آیا ہوا تھا ــــ دراصل وہ کسی لڑکی کو پسند کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ ممی ڈیڈی اس کی شادی اس سے ہی کریں لیکن خود سے ان سے کہہ نہیں پا رہا تھا اور ممی نے بتایا "کوئی لڑکی اس کے لیے پسند کر لی تھی اور اب وہ چاہتا تھا کہ میں اس کی پسند سے ممی کو آگاہ کر دوں۔

پتا نہیں بلال کو دیکھ کر سکندر کو غصہ کیوں آجاتا تھا۔ مگر اس روز تو اس نے حد ہی کر دی اور ایسی ایسی باتیں کیں کہ میں کتنی ہی دیر تک ساکت بیٹھی رہی۔ نہ جانے کتنی دیر بعد میرے ساکت وجود میں جنبش ہوئی میں اٹھی اور چند کپڑے بیگ میں ڈال کر جانے کے لیے کمرے سے نکلی۔ میرے قدم لڑکھڑا رہے

www.allurdu.com

تھے۔ اس سے بڑھ کر اور میری تذلیل کیا ہو سکتی تھی۔
وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا تھا شاید۔

اس کے پاس سے گزرتے ہوئے میرے دل میں شدت سے خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ میرے ہاتھ سے بیگ چھین لے اور ہمیشہ کی طرح سوری کرلے۔ اس کی عادت تھی کہ جب میں روٹھتی تو غیر ارادی طور پر پھر اس کی تلافی کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن آج اس نے مجھے روکا نہیں اور میں اپنے گھر چلی آئی۔۔۔۔ ممی ڈیڈی اور بلال مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"تمہیں تو شام کو آنا تھا اوج؟" بلال نے پوچھا۔

"بس میں ابھی آ گئی۔"

"اور سکندر کہاں ہے؟" ڈیڈی گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"ڈیڈی!" میرا ضبط جواب دے گیا اور میں ان کے سینے سے جا لگی۔

"ڈیڈی! میں تھک گئی ہوں بہت زیادہ۔ سکندر نے جو حصار اپنے گرد کھینچ رکھا ہے، میں شاید کبھی بھی وہ حصار توڑ نہیں سکتی۔ وہ بظاہر نارمل لگتا ہے لیکن وہ نارمل ہے نہیں۔ وہ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر محظوظ ہوتا ہے۔ اسے دوسروں کا صبر اور بے بسی خوش کرتی ہے۔" میں نے روتے ہوئے ہر بات ڈیڈی سے کہہ دی۔ ڈیڈی چپ سے ہو گئے تھے۔

"سوری بیٹا! شاید مجھے سکندر کو سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ تم ریلیکس ہو جاؤ۔ میں سکندر سے بات کرتا ہوں۔"

"نہیں آپ سکندر سے بات نہیں کریں گے۔" میں اس وقت بہت غصے میں تھی۔ "مجھے اب سکندر کے پاس واپس نہیں جانا۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔"

"اوکے بیٹا! ابھی تم غصے میں ہو بعد میں بات کریں گے ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ڈیڈی نے میرے کندھے تھپتھپائے۔ وہ جانے کیا سوچ رہے تھے لیکن میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے اب سکندر کے ساتھ نہیں رہنا۔ یہ انتہا بھی تو اس نے کہا تھا۔ میں اس سے زیادہ تذلیل برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے تو جب سکندر کا فون آیا تو میں نے اس سے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ ڈیڈی نے کہا بھی کہ "سن تو لو وہ کیا کہتا ہے۔" ممی نے مشورہ دیا۔

"سارے دروازے بند نہیں کرنے چاہئیں۔ ایک راستہ رکھنا چاہیے تاکہ اگر پلٹنا چاہیں تو پلٹ سکیں۔"

لیکن مجھے تو نہیں پلٹنا تھا۔۔۔۔ میں نے زندگی بڑے اعتماد اور یقین سے گزاری تھی۔۔۔۔ مجھے ہمیشہ محبتیں ملی تھیں مجھے کبھی کسی نے ڈی گریڈ نہیں کیا۔ ہمیشہ سراہا گیا تعریف کی گئی۔ میرے ٹیلنٹ کی میری ذہانت کی اور میرے کانفیڈنس کی لیکن سکندر نے تو مجھے زیرو کر دیا تھا۔ مجھے اپنا کھویا ہوا اعتماد بحال کرنا تھا۔ اسے کھوجتے کھوجتے میں خود کچھ نہیں رہی تھی۔

مجھے اب مزید نہیں جھکنا تھا۔ سو جتنی بار بھی سکندر کا فون آیا میں نے اس سے بات نہیں کی۔ کیوں کرتی میں اس سے بات۔ کتنی رکیک سی گفتگو بات کی تھی اس نے۔ میں اور بلال ٹال اور میں۔

تب میں نے فیصلہ کیا کہ میں پھر سے جاب کروں گی اور اسی خیال سے میں نے اپنے کاغذات نکالے اگر کہیں جاب کے لیے اپلائی کر سکوں۔ میں اگر حسن خان کے آفس چلی جاتی تو وہ خوشی مجھے پھر سے جاب دے دیتے لیکن میں وہاں جاب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے بیگ سے اپنے کاغذات کی فائل نکالی جو میں آتے ہوئے اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ اندر کی طرف فائل کے گتے پر لکھا تھا۔

میں جانتا ہوں
کہ تیرے سب خواب ریشمی ہیں
تو میری خشک رفاقتوں کا بھرم
کہیں بھی نہ رکھ سکے گا

جانے کب کس وقت سکندر نے یہ مصرعے لکھے تھے۔ میں کتنی ہی دیر تک یونہی سکندر کی تحریر دیکھتی رہی۔ اس کی ہینڈ رائٹنگ بہت خوبصورت تھی۔ کتنے ہی لمحے میرے آنکھوں کے سامنے

کر گزر گئے اور میرے اندر جیسے کچھ پگھلنے لگا۔ ہولے ہولے میرا غصہ ختم ہو گیا اور صرف محبت رہ گئی۔

وہ محبت جو میں نے سکندر سے کی تھی۔ جو میں سکندر سے کرتی ہوں تب سے جب سے اس کے نام کی انگوٹھی میں نے اپنی انگلی میں پہنی۔ میں نے اس کے ساتھ گزارا ایک ایک لمحہ یاد کیا جس میں تو خوشگوار اور خوبصورت لمحے تو گنتے چنتے تھے پھر بھی۔۔۔۔ پھر بھی مجھے لگا میں نے غلطی کی تھی۔

جب بلال علیحدگی اور تنسیخ کی بات کرتا ہے تو میرے اندر جیسے کوئی بھالا اترتا جاتا ہے۔

"نہیں۔۔۔ سکندر نہیں تو کوئی نہیں۔" میں نے کتنی ہی بار اس کے آفس فون کیا۔ کراچی آفس میں بھی اور ابوظہبی آفس میں بھی۔ لیکن پتا نہیں کیوں اس سے رابطہ ہی نہیں ہو پاتا۔ اسد ملک بھی چپ سادھ گئے ہیں۔

"پتا نہیں بھابھی وہ کہاں ہے؟"

ہر بار اس کا یہی جواب ہوتا ہے۔

"یہاں سے تو ابوظہبی ہی گیا تھا لیکن پتا نہیں سائیٹ پر کہاں ہے۔ لیکن آپ پریشان نہ ہوں آ جائے گا۔ وہ یونہی خود کو کام میں گم کر دیتا ہے۔"

اسے کیا خبر کہ میں کیوں پریشان ہوں۔ میرا من مجھے کیا کچھ کہے لگا رہتا ہے۔۔۔۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے جیسے اسے خبر ہو لیکن وہ جان بوجھ کر نہیں بتا رہا۔ شاید سکندر نے اسے منع کیا ہے۔

حالانکہ وہ ایسا تو نہیں تھا پہلے جب بھی زیادتی کرتا تھا تو اسے احساس ہو جاتا تھا اور وہ مختلف حیلوں بہانوں سے اس زیادتی کی تلافی کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن اب کے اس نے بھی تو بات نہیں کی تھی۔ کتنی ہی بار اس کا فون آیا تب۔۔۔ شاید اسے غصہ آ گیا ہو۔۔۔ لیکن وہ پھر بھی تو فون کر سکتا تھا۔۔۔۔ مگر پتا نہیں کیوں اس نے فون نہیں کیا۔ پھر بھی میرا دل کہتا ہے کہ ایک روز وہ آئے گا ضرور مجھے لینے 'وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔

شاید اس نے مجھ سے محبت نہ کی ہو۔

پھر بھی مجھے اس کا انتظار کرنا ہے۔

"یہ سب میری وجہ سے ہوا اوج؟" ابھی کبھی بلال کہتا ہے۔

"کوئی اچھی اچھی سوچ کیوں رکھتے ہیں اور سکندر بھائی! مجھے یقین نہیں آتا۔۔۔۔ وہ تو مجھے بہت اچھے لگے تھے اتنے شاندار اور میں نے تمہاری خوش قسمتی پر رشک کیا تھا۔ کیا خبر تمہیں ان کی بات سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو۔ اوج! کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا۔ موڈ تھکا ہارا آفس سے آتا ہے۔ آفس کا کوئی مسئلہ اسے چڑچڑا کر دیتا ہے۔"

لیکن میں بلال کو کیسے سمجھاؤں۔ وہ تو روز اول سے ایسا ہی ہے۔ اپنی ذات کے سمندر میں ڈوبا۔

لیکن میں نے جلدبازی کی اور آج سے سوچا تک نہ کہ اس کے بغیر زندگی بے معنی ہے۔

وہ تو ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے رہتا ہے۔

اس کا اٹھنا اس کا بیٹھنا اس کی گفتگو اس کے طنز اس کا غصہ اور اس کی وہ کبھی کبھی سراہتی والہانہ نظریں۔

میں نے بلال اور ممی سے کہہ دیا ہے کہ وہ آئندہ مجھ سے تنسیخ والی تکلیف دہ بات نہ کریں۔ ڈیڈی نے از حد حیران ہو کر دیکھا تھا اور ممی جھنجلا گئی تھیں۔

"اس لڑکی کا دماغ خراب ہے۔ اتنی لمبی عمر تنہا کیسے گزرے گی۔"

ڈیڈی نے ممی کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور سوچ میں ڈوب گئے تھے۔۔۔۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

انتظار اور صرف انتظار چاہے یہ انتظار صدیوں پہ محیط ہو جائے۔

میں فون کی ہر بیل پر یوں فون کی طرف لپکتی ہوں جیسے اسی کا فون ہو۔

شاید کسی روز اسے اس محبت کا ادراک ہو جائے جو کسی روز لمحہ بھر کے لیے اس کے دل میں روشنی بن کر اتری تھی اور وہ میرے گھر تک چلا آیا تھا۔

شاید کسی روز وہ ماضی کی زنجیروں سے خود کو آزاد

www.allurdu.com

کرا لے اور حال کی خوبصورتیوں کو پہچان لے۔

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں شاید سکندر کو مجھ پر یقین نہیں تھا۔ تب ہی تو وہ میری طرف آتے آتے لوٹ جاتا تھا۔

شاید اس کے اندر کوئی انتقامی جذبہ پل رہا تھا۔ شاید ماضی میں کسی نے اس کے ساتھ بے وفائی کی ہو ــــ شاید کوئی افرا علوی۔

اور پھر کسی نے اس کا کھونہ بانٹا ہو۔ ڈیڈی نے بتایا تھا کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے سوائے سوتیلے بہن بھائیوں کے۔ جن کا سلوک اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ شاید تب ہی وہ اپنے دکھ کسی سے نہیں کہہ سکا ـــ شاید انجانے میں وہ افرا علوی کی زیادتیوں کا بدلہ مجھ سے لیتا ہو۔

مجھے دکھ دے کر بے بس کر کے خوشی محسوس کرتا ہو۔ لیکن جو کچھ بھی تھا اس کے اور میرے درمیان جو مقدس بندھن ہے میں اسے ہمیشہ باقی رکھوں گی۔ چاہے ممی اور بابا تھک ہی کوشش کیوں نہ کریں۔

کیونکہ میں ماضی کی ایج کمال۔

اور حال کی ایج سکندر، سکندر علوی سے شدید محبت کرتی ہوں۔ اتنی شدید کہ میرا ہر سانس جیسے اس کے سانس کے ساتھ بندھا ہے۔ اور آج ایک سال گزرنے کے بعد بھی میری ہر صبح اس امید کے ساتھ طلوع ہوتی ہے کہ وہ آجائے گا اور ہر شام ایک نئے انتظار کے ساتھ۔

ہاں مجھے اس کا انتظار کرنا ہے۔

چاہے یہ انتظار صدیوں پر محیط ہو جائے۔

اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں ساری دنیا کو اپنی مٹھی میں لے لوں اور توڑ پھوڑ کر رکھ دوں۔ بالکل ایسے ہی جیسے مجھے توڑا پھوڑا گیا ہے یا پھر پوری دنیا کو اپنے قدموں تلے روندتا ہوا گزر جاؤں اور پیچھے مڑ کر دیکھوں اور پھر کہیں بہت بلندی پر کھڑے ہو کر اس روندی کچلی ہوئی دنیا کو دیکھوں اور اس کی بے بسی پر قہقہے لگاؤں۔ زور زور سے ہنسوں اور خوشی سے فضا میں ہاتھ پھیلائے رقص کروں ــــ کہ کل دنیا مجھے روندتا تھا آج یہ میرے قدموں تلے ہے۔

مجھے تو یہ پوری دنیا ہی زہر لگتی ہے۔ یہ چلتے پھرتے مسکراتے فخر سے سر اٹھائے لوگ۔

اعتماد سے بات کرتے ہوئے۔

زندگی میں کامیابیاں حاصل کرتے ہوئے لوگ۔

ہاں مجھے خود اعتماد لوگ اچھے نہیں لگتے۔

ہنستے ہوئے خوش اور مطمئن اور کامیاب لوگ مجھے اپنے دشمن لگتے ہیں۔ ہاں بے بسی سے روتے ہوئے کچھ کرنے کی خواہش رکھتے ہوئے کچھ نہ کر سکنے والے لوگ مجھے پسند ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے تسکین ہوتی ہے۔ عجب طرح کا سکون میرے اندر اتر آتا ہے۔ بڑی طمانیت محسوس ہوتی ہے۔

شاید میرے اندر کچھ نفسیاتی گرہیں ہیں۔

ایک بار ایج نے بھی کہا تھا۔

"سکندر اکرم اپنے آپ کو کھوجتے کیوں نہیں۔ کون سی چیز تمہیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔"

میں ایج پر ہنسا تھا۔

"میرا اب کچھ میرے سامنے ہے۔ میں بھلا کیا کھوجوں اور کیوں؟ ہاں تم نے اپنی ذات کے بہت سارے حصوں پر پردے ڈال رکھے ہیں اور اپنا آپ چھپا رکھا ہے۔ خود سے بھی اور مجھ سے بھی۔"

اس کے صبیح چہرے پر یکدم زردی کھنڈ گئی تھی اور بے بسی سے ہونٹ کاٹتی ایج سکندر کو دیکھ کر مجھے بہت سکون مل رہا تھا بہت طمانیت مل رہی تھی۔ ایسا ہی تو دیکھنا چاہتا تھا میں اسے ـــ بے بس اور کمزور۔

اس بھری دنیا میں کوئی شخص بھی مجھے اچھا نہیں لگتا۔ پوری دنیا مجھے اپنی دشمن لگتی ہے اور میں پوری دنیا کو اپنے قدموں تلے روندنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ مجھے اپنے قدموں تلے روندنے والے اور مجھ پر حقارت سے ہنسنے والے صرف گنے چنے لوگ ہیں۔

نجیب اللہ علوی، مجیب اللہ علوی میرے سوتیلے بھائی۔

اسماء علوی میری سوتیلی بہن۔

اور رقیہ علوی میری سوتیلی ماں۔

میرے اصل مجرم تو یہ ہیں۔

مجھے پاؤں تلے کچلنے مجھے مارنے والے لیکن کبھی کبھی میں اس میں اپنے باپ حمید اللہ علوی اور اپنی ماں افرا علوی کو بھی شامل کر لیتا ہوں۔ حالانکہ میرا باپ جب تک زندہ رہا اس نے مجھ سے بے حد بے حساب محبت کی اپنے بڑے بیٹوں اور بیٹی سے بھی زیادہ۔ کیونکہ میں افرا علوی کا بیٹا تھا۔

اس کی من چاہی بیوی۔

جس سے اس نے پہلی ہی نظر میں محبت کی تھی اور پہلی بار ہی اسے دیکھتے ہی اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سو وہ مجھ سے بے حد محبت کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ مجھے بے بس اور حقیر بنانے میں اس کا بھی ہاتھ ہے۔ وہ میرا پہلا مجرم ہے۔ سو میں کبھی کبھی اس کے لیے اپنے دل میں بڑی نفرت محسوس کرتا ہوں۔ اتنی نفرت کہ اگر وہ بھی زندہ ہوتا اور میرے سامنے ہوتا تو شاید میں کسی روز اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ لیکن اگر وہ زندہ رہتا تو کوئی مجھے قدموں تلے یوں روند سکتا تھا لیکن پھر بھی غلطی تو اس کی تھی اور اس کی غلطی کی سزا مجھے ملی۔ آخر اسے کیا ضرورت تھی کہ اس عمر میں جب اس کے بچے جوان ہو رہے تھے اور شادی کی عمر میں پہنچ رہے تھے خود شادی رچا بیٹھا۔ میں اکثر تنہائی میں سوچتا رہتا ہوں کہ آخر کیا ضرورت تھی اسے اس عمر میں شادی کی۔

خدا نے اسے اولاد دی تھی۔ بیٹے بھی اور بیٹی بھی۔

نجیب اللہ علوی تب بیس سال کا تھا۔

اور اسماء علوی سترہ سال کی۔

اور اس کی شادی کو تیس برس گزر چکے تھے۔ پھر تیس برسوں بعد اسے اچانک رقیہ علوی میں کیا کمی نظر آگئی تھی کہ اس نے اس کی تیس سالہ خدمت گزاریوں کو بھلا دیا۔ حالانکہ میں نے غور کیا تھا کئی بار اور سوچا تھا۔

رقیہ علوی ایک سگھڑ خاتون تھی۔ اس نے گھر کو صاف ستھرا رکھا ہوا تھا۔

کھانے بہت اچھے بناتی تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا۔ مجھے اس کے بنائے کھانوں جیسا مزا اور کہیں نہیں ملا۔

وہ تین ذہین، خوبصورت اور صحت مند بچوں کی ماں تھی، اس کا پلڑا تو بہت بھاری تھا۔ لیکن پھر بھی حمید اللہ علوی نے میری ماں افرا علوی سے شادی کر لی۔

میری ماں سے شاید اس لیے کہ وہ بہت خوبصورت تھی۔

کم عمر تھی۔ نازک تھی۔ جب حمید اللہ علوی نے اس سے شادی کی تو اس کی عمر صرف بیس سال تھی۔

اور نجیب اللہ علوی بھی بیس سال کا تھا۔

حیرت ہے کہ حمید اللہ علوی نے اسے اپنے لیے پسند کر لیا، حالانکہ وہ چاہتا تو اسے اپنی بہو بنا سکتا تھا اور اس سے شادی کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوچا کہ جس لڑکی سے وہ شادی کرنے والا ہے وہ اس کے بیٹے کی ہم عمر ہے اور مجھے اپنے باپ پر نہیں اپنی ماں پر بھی بہت غصہ ہے۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ اگر کبھی وہ میرے سامنے مجسم ہو کر آجائے تو میں اس سے پوچھوں کہ آخر ایسی کیا آفت پڑی تھی کہ اس نے ایک تین بچوں کے باپ سے شادی کر لی۔

مانا کہ اس کے والدین فوت ہو چکے تھے اور وہ رشتے کے کسی عزیز کے ہاں رہ رہی تھی اور ان کے جوان ہوتے بچوں کی وجہ سے اسے مزید رکھنے سے قاصر تھے اور چاہ رہے تھے کہ جلد از جلد اسے بیاہ دیں۔ شاید وہ بھی اس کی خوبصورتی سے جلتے تھے۔ اور انہیں ڈر تھا کہ کہیں ان کے لڑکوں میں سے کوئی اس قاتل حسن کے سامنے ہتھیار نہ ڈال دے۔ جبکہ وہ اپنے بیٹوں کی شادیاں، خوبصورتی اور تعلیم کو پیش کروانا چاہتے تھے اور کسی امیر گھرانے سے رشتہ جوڑ کر اپنے بیٹوں کے لیے وہ

www.allurdu.com

سب کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے جو وہ افزا علی سے اپنے کسی بیٹے کو بیاہ کر نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن پھر بھی انہیں افزا سے محبت تھی اور دی تھی۔ آخر وہ ان کے گھر کی بڑی بہو تھی۔ اس لیے انہوں نے حمید اللہ علوی کا پرپوزل قبول کرنے سے پہلے کچھ شرائط منوائی تھیں۔ مثلاً ایک پورشن، ماہانہ خرچ اور ایک فلیٹ اس کے نام۔ بزنس میں اس کا اور اس کی اولاد کا حصہ۔

اور حمید اللہ علوی نے ان کی ہر شرط مان لی تھی۔ اور رخصتی سے پہلے ہی اپنے وسیع و عریض گھر کے فرسٹ فلور میں کچھ تبدیلیاں کر کے اسے نہ صرف نئے سرے سے ڈیکوریٹ کیا تھا بلکہ اس کی سیڑھیاں جو پہلے ٹی وی لاؤنج میں تھیں انہیں باہر کی سمت بھی کروا دیا تھا یوں بالکل الگ پورشن بن گیا تھا اور افزا علوی جب رخصت ہو کر علوی بلڈنگ میں آئی تو اسے کسی جھگڑے یا تلخی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

پھر بھی مجھے اپنی ماں پر بہت غصہ آتا تھا۔ آخر حمید اللہ علوی سے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی کیا وہ کچھ انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ ممکن تھا اسے حمید اللہ علوی سے بہتر کوئی شخص مل جاتا جس کے تین بچے نہ ہوتے۔

اور نہ ہی ایک بیوی ہوتی۔

حالانکہ وہ پڑھی لکھی تھی، خوبصورت تھی اور اسے یقیناً کوئی بہتر شخص مل جاتا۔ لیکن اس نے بھی سوچا تھا کہ حمید اللہ علوی جس نے اپنی آدھی جائیداد اس کے نام لکھ دی تھی اپنی نو عمر بیوی کی بہت قدر کرے گا اور وہ ساری عمر بادشاہت کرتی رہے گی۔

لیکن ——

حمید اللہ علوی ایک دن اسے روتا بلکتا چھوڑ کر چلا گیا۔

آخر کو وہ غاصب تھی۔

رقیہ بیگم کی بادشاہت کی غاصب۔

تو اس سے جتنا بھی برا سلوک کیا جاتا کم تھا۔ ہاں تو مجھے اپنی ماں پر غصہ تھا کہ اس نے حمید اللہ علوی کے بجائے کسی اور سے شادی کیوں نہ کی۔ بھلے وہ شخص امیر نہ ہوتا لیکن مجھے رقیہ علوی سے یہ تو نہ سننا پڑتا کہ ڈائن غاصب ڈکیت۔

وہ اکثر ان ہی ناموں سے افزا علوی کو یاد کرتی تھی۔ اس لیے مجھے اپنی ماں پر غصہ آتا تھا۔ کیا ضرورت تھی اسے غاصب بننے کی۔ میں نے اکثر اپنی سوتیلی ماں رقیہ علوی سے سنا تھا کہ ایک شادی میں حمید اللہ علوی اسے دیکھ کر دل ہار بیٹھے تھے اور ایک نظر دیکھتے ہی انہوں نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ انہوں نے پہلے سے ہی دوسری شادی کا ارادہ کر رکھا تھا یا اچانک ہی افزا علی کو دیکھ کر فیصلہ کیا تھا لیکن بقول رقیہ علوی کے اس روز شادی کی اس تقریب میں افزا علی کو دیکھ کر حمید اللہ سے صبر نہ ہو سکا تھا اور وہ اگلی صبح ہی افزا کے رشتہ داروں کے گھر جا پہنچے تھے اور انہوں نے حمید اللہ کے پرپوزل کو نعمت سمجھ کر فوراً قبول کر لیا تھا۔ اور جب رقیہ علوی اپنی اکڑی ناک کو بھول کر افزا علی کی منت کرنے گئی تھی کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے اور اس شادی سے انکار کر دے تو وہ پہلے تو مسلسل روتی رہی تھی اور پھر جب رقیہ علوی نے اپنی انانیت کو مار کر اپنے ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے تھے تو اس نے وعدہ کر لیا تھا۔ لیکن پھر اس وعدے کو نبھایا نہ تھا اور بڑی شان سے حمید اللہ کی گاڑی میں بیٹھ کر علوی ہاؤس آ گئی تھی۔ بقول رقیہ علوی کے اس کے سینے پر مونگ دلنے کے لیے۔ لیکن رقیہ علوی کے برعکس۔

ایک بار ماں بابا نے مجھے بتایا تھا کہ ایسا نہیں تھا۔ حمید اللہ علوی اس کو پہلی ہی نظر دیکھ کر اس پر فدا نہیں ہوا تھا بلکہ اس شادی میں افزا علی کے گھر جن جو حمید اللہ کے اچھے خاصے دوست بھی تھے انہوں نے حمید اللہ علوی سے خود درخواست کی تھی کہ افزا کے رشتے کے سلسلے میں وہ اس کی مدد کریں اور حمید اللہ نے اپنے آپ کو پیش کر دیا تھا حالانکہ وہ اپنے بیٹے کے لیے بھی افزا علی کا رشتہ مانگ سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔

بہر حال وجہ جو بھی ہو مجھے ان دونوں سے شکوہ ہے۔ گلہ ہے اور ان پر بہت سارا غصہ ہے۔

حالانکہ حمید اللہ علوی نے افزا علی کو جو اب حمید اللہ سے شادی کرنے کے بعد افزا علوی بن گئی تھی۔ سچ مچ پھولوں کی سیج پر بٹھا دیا تھا۔ شریعت اور مذہب کے راستے پر چلتے ہوئے وہ تین دن رقیہ کے ہاں رہتا اور تین دن اس کے ہاں اور کوشش کرتا کہ کسی کے حقوق کی بھی پامالی نہ ہو۔ اگر وہ افزا علوی کے لیے کوئی چیز لاتا تو رقیہ کے لیے بھی ضرور لاتا۔ اس نے افزا کو کنگن بنوا کر دیے تو رقیہ کے لیے بھی لے گیا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ ساری جیولری جو وقتاً فوقتاً حمید اللہ علوی نے افزا علوی کو لا کر دی تھی اس کی وفات کے بعد نجیب اللہ علوی اور حبیب اللہ علوی نے ماں کے ساتھ مل کر چھین لی تھی۔

حمید اللہ تین بچوں کا باپ تھا۔ عمر میں افزا علی سے بہت زیادہ تھا پھر بھی افزا علوی اس کی سنگت میں اتنی خوش تھی کہ شاید وہ کسی ہم عمر کے ساتھ بھی نہ ہوتی۔ خوشی اور مسرت نے اسے پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت بنا دیا تھا ایسے میں میری یعنی سکندر علوی کی آمد نے افزا علوی کو معتبر اور مکمل کر دیا تھا۔

اور اب مجھے نہیں حمید اللہ علوی توازن برقرار رکھتے رکھتے تھک گیا تھا۔ رقیہ بیگم کی زبان پر کانٹے اگ آئے تھے یا سکندر علوی کی شرارتیں اور حرکتیں ہی اتنی پیاری تھیں کہ حمید اللہ علوی ہولے ہولے صرف افزا علوی کا ہی ہو کر رہ گیا تھا۔

مہینوں بعد اسے پیچھے جانے کا خیال آتا اور اب جانے لگا تو افزا علوی نے اسے پیچھے جانے سے منع کیا تو یہ صرف الزام تھا رقیہ علوی کا کہ افزا نے اسے منع کر دیا ہے۔ لیکن وہ باہر ایک سے کہتی پھرتی تھی اور حمید اللہ علوی اس کی اس بات کی بالکل پروا نہ کرتا تھا۔ اور سکندر کے یوں لاڈ اٹھاتا جیسے وہ اس کا پہلوٹھی کا بچہ ہو۔ اس کے لیے اس نے کھلونوں کے ڈھیر لگا دیے تھے۔

پانچ سال کی عمر تک وہ اسے گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتا تھا۔ افزا حمید اللہ علوی کو اس کے یوں لاڈ اٹھاتے دیکھ کر ہنستی۔

"کیا آپ نے پہلے بچوں کے بھی یونہی لاڈ اٹھائے ہیں۔"

"نہیں، نجیب جب پیدا ہوا تو مجھے وہ پیارا تو بہت لگتا تھا لیکن اس کو پیار کرتے شرم آتی تھی کہ اماں ابا کیا سوچیں گے اور پھر جب حبیب ہوا تو نجیب چونکہ دادا دادی کا لاڈلا تھا اس لیے حبیب ماں اور نانی کا لاڈلا بن گیا۔ میں جب گھر آتا تو اس وقت عام طور پر اپنے ماموں یا نانی کی طرف گیا ہوتا۔ ہاں میں نے اسما کے لاڈ اٹھائے ہیں۔ لیکن یہ —— یہ سکندر علوی تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ سب سے پیارا اس لیے کہ یہ محبت کی نشانی ہے۔ افزا میں نے تم سے محبت کی ہے۔"

یوں میں یعنی سکندر علوی نے سات سال کی عمر تک بہت لاڈ اٹھوائے۔ تین سال کی عمر میں مجھے حمید اللہ علوی نے —— شہر کے سب سے بہترین اسکول کی نرسری میں داخل کروا دیا تھا اور دو سال اس کنڈر کیمپس میں پڑھنے کے بعد امریکن گرامر اسکول میں مجھے داخل کروا دیا گیا۔ جہاں میں نے تقریباً دو سال پڑھا اور اس وقت جب حمید اللہ علوی کا انتقال ہوا تو میری عمر سات سال تھی اور میں کلاس ٹو کا طالب علم تھا —— بہت ذہین اور لائق۔

میں نے ون میں پوزیشن لی تھی اور جس روز سالانہ فنکشن میں حمید اللہ علوی اور افزا علوی نے مجھے اسٹیج پر جا کر انعام لیتے دیکھا تھا تو مجھے یاد ہے خوشی سے بہت دیر تک وہ تالیاں بجاتے رہے تھے اور جب میں اپنی شیلڈ لے کر ان کے پاس آیا تھا تو حمید اللہ علوی نے مجھے اتنی دیر تک بانہوں میں لے کر بھینچا تھا کہ میں گھبرا گیا تھا۔ اور انہوں نے واپس گھر آتے ہوئے بار بار کہا تھا۔

"سکندر! اگلے سال بھی تمہاری شیلڈ پر فرسٹ ہی لکھا ہونا چاہیے۔ اور اگر تم میں بھی فرسٹ آئے تو میں تمہیں بہترین گفٹ لے دوں گا۔" لیکن پھر وہ

www.allurdu.com

میرے امتحان سے پہلے ہی چلے گئے۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس روز رقیہ علوی کو نہ جانے کس بات پر غصہ آیا ہوا تھا۔ وہ بہت چیخ چیخ کر بول رہی تھیں۔ اتنا چیخ کر کہ ان کی آواز اوپر تک آ رہی تھی۔

"یہ نیچے والی آنٹی اتنا کیوں چیخ رہی ہیں؟"

میں نے اپنی مما سے پوچھا تھا۔ میں انہیں آنٹی ہی کہتا تھا اور اس وقت مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ رقیہ علوی سے میرا کیا رشتہ ہے اور یہ کہ رقیہ علوی حمید اللہ علوی کی بیوی ہے۔

اور افرا علوی نے سہم کر حمید اللہ علوی کی طرف دیکھا تھا۔

"آپ کتنے دنوں سے نیچے نہیں گئے۔"

"بہت دنوں سے۔" وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھے رہے۔

"آپ کو جانا چاہیے تھا۔" افرا علوی نے کہا۔

میں قریب بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اور یہ باتیں میرے ذہن میں اس لیے بھی رہ گئی ہیں کہ اس روز اس صوفے پر میں نے آخری بار حمید اللہ علوی کو بیٹھے اور باتیں کرتے دیکھا تھا۔۔۔ آپ کو حیرت تو ہو گی کہ میں اپنے باپ کو حمید اللہ علوی کہہ کر کیوں بلاتا ہوں۔۔۔ پاپا، ڈیڈی یا ابو کیوں نہیں کہتا۔۔۔ جب وہ زندہ تھے تو انہیں پاپا کہتا تھا لیکن پھر ان کے بعد کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد میں انہیں حمید اللہ علوی ہی کہنے لگا۔

شاید اس لیے کہ رقیہ علوی ہمیشہ ان کا ذکر کرتے ہوئے حمید اللہ ہی کہتی تھی۔

یا پھر اس لیے کہ جب میں نے انہیں یعنی اپنے باپ کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا تو وہ میرے لیے پاپا نہ رہے صرف حمید اللہ علوی رہ گئے۔ ہاں تو حمید اللہ علوی اس روز صوفے پر بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے انہوں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔۔۔

"کیا کروں جتنی دیر نیچے رہتا ہوں۔ ٹینس رہتا ہوں۔ بچے بات نہیں کرتے اور رقیہ مسلسل طنز

چھوٹی رہتی ہے۔"

"پھر بھی آپ کا فرض ہے کہ ان کی خبر گیری کریں اور حال احوال پوچھیں۔ کل میں بچوں کی طرف جانے کے لیے سیڑھیوں سے اتری تو اسماء کو میں نے گیٹ سے نکلتے دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔۔۔ مجھے دیکھ کر منہ موڑ لیا۔ میں نے بلایا بھی۔۔۔ پوچھا بھی کہ کیا بات ہے۔ لیکن اس نے جواب نہ دیا اور گیٹ بند کر کے واپس اندر چلی گئی۔"

"ماں سے ضد کی ہو گی کچھ لینے کی اور ضد پوری نہ ہونے پر رو رہی ہو گی۔ وہ ایسی ہی ہے۔"

حمید اللہ علوی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اتر آئی اور وہ کھڑے ہو گئے۔

"میں دیکھتا ہوں۔ ضرور کوئی بڑی فرمائش ہو گی کوئی بہت قیمتی سوٹ یا جیولری۔"

"لے دیجیے گا۔" افرا علوی بھی مسکرائی۔ "بچیاں ماں باپ سے ہی لاڈ کرتی ہیں۔ پھر پتا نہیں اگلے گھر میں کوئی فرمائشیں پوری بھی کرتا ہے یا نہیں۔"

اور اپنا والٹ جیب میں ڈال کر حمید اللہ علوی نیچے اتر گئے اور اس وقت اگر مجھے خبر ہوتی۔ اب حمید اللہ علوی کبھی واپس نہیں آئے گا اور میری زندگی جہنم بن جائے گی تو میں اس کے قدموں سے لپٹ جاتا، زنجیر بن جاتا اور روک لیتا۔۔۔ لیکن میری طرح افرا علوی بھی بے خبر تھی اور وہ اسی طرح مسکراتی ہوئی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"سولو! تمہیں ایک بہن چاہیے۔ چھوٹی سی پیاری سی۔ گڑیا جیسی۔ تو اللہ میاں سے دعا کرو کہ اللہ تمہیں ایک پیاری سی گڑیا سی بہن دے دے۔"

"نہیں مما۔ میں بہن لے کر کیا کروں گا۔ مجھے تو بھائی چاہیے۔۔۔ جس سے کرکٹ کھیل سکوں۔"

"لیکن مجھے تو بیٹی چاہیے نا۔ جب تم اور تمہارے پاپا گھر نہیں ہوں گے تو ہم دونوں مل کر تمہارے لیے کھانے تیار کریں گے اور تمہارا انتظار کریں گے تمہاری بہن تمہیں کپڑے استری کر کے دے گی۔ تمہارا کمرہ صاف کرے گی۔ بہنیں تو بہت اچھی ہوتی

ہیں۔"

"اچھا!" میں افرا علوی کی بات پر ایمان لے آیا تھا۔ "میں اللہ میاں سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے ایک بھائی اور ایک بہن دونوں دے دے۔"

میں نے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے اور افرا علوی کھلکھلا کر ہنس دی۔ اور یہ آخری ہنسی تھی جو میں نے افرا علوی کے ہونٹوں پر دیکھی تھی۔ پھر میں نے کبھی افرا علوی کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ ہنستے ہنستے میرے پاس سے اٹھی تھی اور میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے کہ نیچے سے زور زور سے رونے پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ افرا علوی کی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا اور ہونٹ بند ہو گئے۔

"مما!" میں نے ہاتھ نیچے گرا دیے۔ "یہ کیسا شور ہے۔" لیکن افرا علوی میری بات کا جواب دیے بغیر آنکھوں میں وحشت بھرے نیچے دوڑتی چلی گئی تھی۔ اور میں بھی اس کے پیچھے بھاگا تھا میرے ذہن میں یہ بات آ گئی تھی کہ ضرور نیچے والی آنٹی کے ہاں کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ وہاں سب لوگ ٹی وی لاؤنج میں جمع تھے۔

اسماء علوی اور رقیہ علوی چیخیں مار رہی تھیں جبکہ نجیب اللہ علوی اور حبیب اللہ علوی خاموش کھڑے تھے۔ اور ٹی وی لاؤنج کے بیچوں بیچ حمید اللہ علوی گرے پڑے تھے۔ افرا علوی بھاگتی ہوئی ان کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی تھی۔ اور کبھی کلائی ہاتھوں میں لے کر نبض دیکھتی کبھی بند آنکھوں کو تب ہی گیٹ پر ایمبولینس کا ہارن بجنے لگا۔

"اب ایمبولینس کا کیا فائدہ ڈیڈی ختم ہو چکے۔" مجھے ابھی تک نجیب اللہ علوی کے لہجے کی سرد مہری یاد ہے۔

"لیکن پھر بھی ڈاکٹر کو تو آنے دو۔ تصدیق تو کرے۔" میں سہما سہما سا کھڑا حمید اللہ علوی کو دیکھ رہا تھا جس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ خطرناک حد تک زرد۔۔۔ پھر ڈاکٹر نے آ کر تصدیق کر دی۔ مجھے یاد ہے وہیں لاؤنج میں ہی ایک چارپائی پر حمید اللہ علوی کو لٹا دیا گیا تھا اور میں حیران تھا کہ پاپا کو یہاں کیوں لٹا دیا گیا ہے اگر وہ بیمار ہیں تو پھر بھی انہیں اپنے گھر میں ہونا چاہیے۔

"مما!" میں نے یہی بات پوچھنے کے لیے جب افرا علوی کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ مجھے بازوؤں میں بھینچ کر زور زور سے رونے لگی۔

"سولو! تیرے پاپا چلے گئے وہ مر گئے۔"

اور پھر اس نے چارپائی کی پٹی پر زور زور سے سر مارا اپنی چوڑیاں توڑ دیں۔

میں بھی رونے لگا اور کبھی چپ ہو جاتا اور افرا علوی کا دامن کھینچنے لگتا کہ اوپر اپنے گھر چلو لیکن وہ تو بس روئے چلی جاتی۔ اور پھر پتا نہیں کب میں روتے روتے افرا علوی کی گود میں ہی سو گیا تھا۔ اور جب دوبارہ میری آنکھیں کھلی تھیں تو نجیب اللہ علوی افرا علوی کو دھکے دے رہا تھا۔

"نکل جاؤ یہاں سے۔"

"نہیں نہیں۔" وہ چیخ رہی تھی۔ "مجھے مت نکالو یہاں سے مجھے آخری بار ان کا چہرہ دیکھ لینے دو۔"

نجیب اللہ علوی کی آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی۔ پھر کچھ لوگ اسے پکڑ کر لے گئے۔ اردگرد ہجوم تھا۔ لوگوں کی بھنبھناہٹ تھی۔

"افرا کو بیاہ کر لایا تھا حمید اللہ علوی پوری شان سے۔ حق سچ کی بیوی ہے وہ کوئی بھگا کر تو نہیں لایا تھا" "کوئی کیسے اٹھا سکتا ہے اسے اس کی میت سے۔"

ایسی ہی سرگوشیاں میرے کانوں میں پڑتی رہیں اور ان کے معنی بہت بعد میں جان پایا میں۔ افرا علوی ہر وقت روتی رہتی۔

"مما! آپ نہ رویا کریں۔" مجھے اس کے رونے سے گھبراہٹ ہوتی۔

"میں ہوں نا۔۔۔ پھر آپ کو کیوں ڈر لگتا ہے یا پھر اللہ میاں سے کہیں وہ ہمیں بھی اپنے پاس بلا لے۔ ہم بھی وہاں ہی رہیں گے پاپا کے پاس۔"

اور وہ مجھے لپٹا کر اور زیادہ رونے لگتی۔ پھر ہوتے ہوتے اس کا رونا کم ہو گیا۔ وہ کچھ سوچنے لگی۔ پھر ایک

دن اسکول سے لیٹر آ گیا۔ کہ اگر میں نے مزید چھٹیاں کیں تو میرا نام کاٹ دیا جائے گا۔ تب افزا علوی میری انگلی پکڑ کر پھر ایک بار پہنچ گئی۔ نجیب علوی سامنے ہی صوفے پر بیٹھا تھا۔
"کیوں آئی ہو؟" اس کے لہجے میں اتنی حقارت اور آنکھوں میں اتنی نفرت تھی کہ میں نے سہم کر اور مضبوطی سے افزا کی انگلی تھام لی۔
"سنو کے اسکول سے لیٹر آیا ہے۔ اگر اسکول نہ گیا تو نام کٹ جائے گا" تم صبح جاتے ہوئے اسے اسکول چھوڑ جایا کرو۔ اسی کالج جاتی ہے تم جاتے ہو نا اسے چھوڑنے۔ یہ بھی تمہارا بھائی ہے تمہارے باپ کا خون اس کی رگوں میں ہے۔"
"او شٹ!" نجیب اللہ علوی غصے سے پھنکارا۔
"نہیں ہے یہ میرا بھائی۔"
اور تب ہی رقیہ علوی کسی کمرے سے باہر نکلی۔
"افزا بیگم! میرے گھر میں قدم رکھنے کی تمہیں جرأت کیسے ہوئی نکل جاؤ یہاں سے اور آئندہ قدم مت رکھنا نہیں تو دھکے دے کر نکلواؤں گی۔ غاصب ڈائن میرے سہاگ کو کھا گئی۔ میرے بچوں سے ان کا باپ چھیننے والی۔"
اس نے افزا علوی کو ہلکا سا دھکا دیا اور افزا علوی روتے ہوئے باہر نکل آئی۔ وہ عورت تھی لیکن اب ہر روز مجھے اسکول چھوڑنے اور لینے جاتی۔ ان دنوں میں افزا علی سے شدید محبت کرتا تھا اگر وہ چند منٹ کے لیے بھی ادھر ادھر ہوتی تو میں گھبرا جاتا۔ خوف زدہ ہو جاتا آگے سے آوازیں دینے لگتا۔ وہ کچن میں ہوتی تو میں کچن کے نزدیک بیٹھا ہوم ورک کرتا اور گاہے گاہے اسے پکارتا رہتا۔
وہ واش روم میں جاتی تو واش روم کے باہر کھڑا رہتا۔ اسے ہاتھ دھونے میں دیر ہو جاتی تو میں گھبرا کر دروازہ کھٹکھٹانے لگتا۔ میرے دل میں خوف سا بیٹھ گیا تھا کہ کہیں حمید اللہ علوی کی طرح کسی دن اچانک وہ بھی اللہ میاں کے پاس نہ چلی جائے۔ میں اکثر رات کو جب بیڈ پر سونے کے لیے لیٹتا تو انہیں یاد کر کے چپکے چپکے روتا جب وہ زندہ تھے تو میں ان ہی کے پاس سوتا تھا۔ ان دنوں تو ممّا اور پاپا ہی میری زندگی تھے۔ مجرم تو وہ بہت بعد میں بنے تھے میرے۔ میں افزا علوی اور حمید اللہ علوی سے بہت شدید محبت کرتا تھا۔ میں نے ان کے علاوہ کسی اور رشتے کو نہیں دیکھا تھا۔ میری ساری محبتوں کا محور یہی دونوں تھے۔
حمید اللہ علوی اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے اور افزا علوی کے والدین کا بھی انتقال ہو چکا تھا اور رشتے کے وہی عزیز جنہوں نے اس کی پرورش کی تھی وہ بھی اس شہر سے کہیں اور جا چکے تھے۔ افزا علوی اکثر انہیں یاد کرتی تھی۔
"انکل صلاح الدین اور آنٹی مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ بہت پیار سے رکھا انہوں نے میں جو دو سال کی تھی جب ایک حادثے میں والد کی وفات کے بعد میں بے یار و مددگار رہ گئی تھی۔ وہ گھر جس میں ہم رہتے تھے گورنمنٹ کی طرف سے ملا ہوا تھا اور اس بھرے شہر میں انکل صلاح الدین کے علاوہ میرا کوئی عزیز نہ تھا۔ بلکہ انکل صلاح الدین سے بھی بہت دور کی قرابت تھی اصل وجہ تو یہ تھی کہ انکل میرے ابا کے بہت گہرے دوست تھے۔ میری والدہ میرے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھیں۔ میں نے کسی قریبی عزیز کا ذکر ابا سے بھی نہیں سنا تھا اگر کوئی ہوں بھی تو ابا نے کبھی ذکر کیا نہ وہ کبھی آئے اس لیے جب مجھے گھر خالی کرنے کے لیے کہا گیا تو انکل صلاح الدین مجھے اپنے گھر لے گئے۔ ان کی بیٹی نہیں تھی بس تین بیٹے تھے کمال، جمال اور نہال۔۔۔ کمال اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر گئے ہوئے تھے اور نہال اور جمال مجھے بے حد چاہتے تھے بالکل بہنوں کی طرح۔"
"تو اب وہ کہاں ہیں؟" میں پوچھتا۔ "وہ ہمارے گھر کیوں نہیں آتے؟"
"پتا نہیں۔" افزا علوی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔
"میری شادی کے بعد وہ لوگ یہاں سے کسی اور شہر میں شفٹ ہو گئے تھے۔"

"کیا وہ بتا کر نہیں گئے تھے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔"
"نہیں۔۔۔ شاید ان دنوں ہم لوگ یہاں نہ تھے میں اور تمہارے پاپا کاغان گئے ہوئے تھے۔"
"اور اگر وہ آ جائیں تو؟"
میں ان دنوں اکثر سوچتا اور دعا کرتا رہتا تھا کہ اللہ کرے ایک روز جمال اور نہال ماموں آ جائیں تو پھر ہم مل کر نجیب اللہ کو خوب ماریں گے۔"
میں ہوا میں مکے چلاتا۔
میں ماموں کو بتاؤں گا کہ نجیب اللہ علوی نے ممّا سے بدتمیزی کی تھی اور کیا پتا انہوں نے ہی پاپا کو مار دیا ہو۔ ان دنوں مجھے شک ہی نہیں یقین تھا کہ پاپا کو انہوں نے مارا ہے۔ مجھے کہانیاں اور وہ بھی جاسوسی پڑھنے کا بہت شوق تھا۔
ان دنوں اس کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ اس لیے اس نے میرے لیے ویگن لگوا دی تھی۔ میں اب تھرڈ کلاس میں آ گیا تھا۔ اور میں نے نو کلاس میں بھی پہلی پوزیشن لی تھی۔ ہمارا سالانہ فنکشن ہونے والا تھا لیکن پاپا نہیں تھے اور ممّا کی طبیعت خراب تھی۔ اس روز جب میں اسٹیج پر انعام لینے جا رہا تھا تو میں نے کئی بار مڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔ لیکن ممّا پاپا نہیں تھے اور اس روز کسی نے بہت دیر تک میرے لیے تالیاں نہیں بجائی تھیں اور نہ ہی کسی نے مجھے بہت دیر تک چوما تھا۔ میں ایک کونے میں کھڑا ہو کر رونے لگا۔ تب سرجان میرے پاس آ گئے۔
"ہیلو وائے Whats matter"
"نتھنگ سر" میں نے آنسو پونچھ لیے۔
ہمارے اس امریکن گرامر اسکول میں زیادہ تر اسٹاف غیر ملکی تھا۔۔۔ سرجان بھی ہالینڈ سے آئے تھے۔ اور اسکول کے ہاسٹل کے قریب ہی اسٹاف کی کالونی میں رہتے تھے۔
انہوں نے ہولے سے میرے گالوں کو چھوا۔ "Be brave" بہادر بنو ہم سب کو ایک دن مرجانا ہے۔"
انہوں نے پھر میرے گال تھپتھپائے۔ "اور خدا سے دعا کرو کہ تمہارا ڈیڈ جنت میں جائے۔"
جب میں گھر آیا تو افزا علوی کی گود میں منہ چھپا کر بہت دیر تک رویا اور افزا علوی بھی مجھے بانہوں میں لپیٹ کر دیر تک روتی رہی میں نے اپنی شیلڈز اور سرٹیفکیٹ پاپا کی تصویر کے ساتھ وہاں رکھ دیے جہاں پہلی شیلڈ پڑی تھی۔ اس روز میرا بہت جی چاہا کہ اللہ میاں تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی میرے پاپا کو بھیج دیں۔۔۔ یا پھر جمال ماموں اور نہال ماموں اور کمال ماموں آ جائیں۔
اس وقت میں نے اس پر کبھی غور نہیں کیا تھا کہ ممّا کو تو ان کا ایڈریس معلوم نہیں تھا نہیں تو افزا علوی کا ایڈریس پتا تھا اور وہ جو اتنی محبت سے جمال ماموں اور نہال ماموں کا ذکر کرتی تھی تو وہ آ سکتے تھے۔ خود اس سے ملنے اور جب مجھے اس کا خیال آیا تھا تو میں دس سال کا تھا اور میں نے یہی بات افزا علوی سے پوچھ لی تھی۔
"ممّا! جمال ماموں اور نہال ماموں کو تو ہمارا گھر پتا ہے نا تو اتنے سالوں میں وہ خود کیوں نہیں آ گئے۔"
اور افزا علی یکدم خاموش ہو گئی تھی اور پھر اس نے سر جھکا کر کہا تھا۔
"پتا نہیں۔" اور اٹھ کر کچن میں چلی گئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس روز جب فنکشن تھا میں روتے روتے سو گیا تھا۔ اور جب میری آنکھ کھلی تھی تو افزا علوی کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس نے کمرے لاک کیے تھے اور مجھے تیار ہونے کو کہا تھا۔
"ممّا! ہم کہیں جا رہے ہیں؟ کیا جمال ماموں کے گھر؟"
میں نے شاید تصور ہی تصور میں جمال کو اپنا آئیڈیل بنا لیا تھا۔۔۔ افزا علوی سے اس کا ذکر سن سن کر وہ وکیل تھا اور بہادر تھا وہ غلط بات برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ وہ غنڈوں سے بھی لڑ جاتا تھا شاید اس لیے۔

www.allurdu.com

"نہیں۔ ہم ہاسپٹل جارہے ہیں۔"
"کیا آپ کی طبیعت خراب ہے؟"
"نہیں وہاں سے ہم تمہارا بھائی یا بہن لے کر آئیں گے۔"
اور میں خوش ہو گیا۔ افرا علوی سے اور کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اور دوڑ دوڑ کر وہ ساری چیزیں جو افرا علوی نے لی تھیں، اکٹھی کر کے باسکٹ میں رکھنے لگا۔ پھر افرا علوی کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم ہاسپٹل آ گئے۔

وہاں ایک نرس سے افرا علوی نے کچھ بات کی۔ شاید افرا علوی نے اس دن کے لیے پہلے ہی اس سے بات کی ہوئی تھی۔

"تو بیٹا!" نرس نے مجھے پیار کیا۔

افرا علوی نے بھی مجھے کہا کہ میں اس نرس کے ساتھ چلا جاؤں۔ میں چل اٹھا کہ میں اس کے ساتھ رہوں گا۔ مجھے خوف تھا کہ اگر وہ اکیلی ہو تو کہیں حمید اللہ علوی کی طرح ہی اللہ میاں کے پاس ہی نہ چلی جائے لیکن افرا علوی نے مجھے سمجھایا کہ ہاسپٹل میں بچوں کو رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ اور پھر وہ نرس مجھے اپنے کوارٹر میں چھوڑ گئی جو ہاسپٹل کے اندر ہی تھا۔ وہاں ایک اور نرس بھی تھی اس نے مجھے رات کا کھانا کھلایا تھا اور سونے کی تاکید کی تھی لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور میرا دل خوف سے کانپ رہا تھا۔ پھر اس نرس نے مجھے کہانی سنائی تھی بہت دلچسپ اور میں کہانی سنتے سنتے سو گیا تھا۔

نرس نے صبح ہی صبح آ کر خوشخبری سنائی "تمہارا بھائی آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے پھولوں کی ٹوکری میں رکھ کر نیچے بھیج دیا ہے تمہاری مما کے پاس۔"

"لیکن اللہ میاں اس بھائی کو ہمارے گھر بھی تو بھیج سکتے تھے مجھے یہاں نیند نہیں آ رہی تھی۔"

میں شاید اندر سے بہت ناراض سا تھا۔ تب میری خفگی پر نرس زور سے ہنس دی تھی یہ نرس بھی عجیب تھی۔ زور سے ہنستی تھی اور فوراً رو بھی پڑتی تھی۔ میں جب اس کے ساتھ ہاسپٹل جا رہا تھا۔ افرا علوی اور بھائی کو دیکھنے۔ تو میں نے اس سے پوچھا تھا۔

"سسٹر! کیا اللہ میاں نے جس طرح سے میرے بھائی کو بھیجا ہے۔ کیا میرے پپا کو نہیں بھیج سکتے۔ میں اگر دعا کروں تو۔"

"بھائی تو چھوٹا سا ہے نا اور۔۔۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "پپا تو بڑے ہیں نا وہ چھوٹی سی باسکٹ میں کیسے آ سکتے ہیں۔"

"لیکن سسٹر! اللہ میاں تو سب کچھ کر سکتا ہے نا۔ اس نے یہ اتنی بڑی دنیا بنائی ہے۔ ہم سب کو بنایا ہے تو وہ بڑی ساری ٹوکری بھی بنا سکتا ہے نا۔"

مجھے حجت کرنے کی عادت تھی لیکن سسٹر رونے لگی اس نے مجھے لپٹایا اور پیار کیا۔

میں ہاسپٹل پہنچنے تک مسلسل سوال کرتا رہا۔ اور سسٹر مسکرا مسکرا کر میرے سوالوں کے جواب دیتی رہی وہ بہت پیارا اور خوبصورت تھا اور میرا دل اسے دیکھ کر خوشی سے بھر گیا تھا اور میں نے دل ہی دل میں بہت دعائیں کی تھیں کہ وہ جلدی سے بڑا ہو جائے۔ افرا علوی کی آنکھوں میں نمی تھی اور وہ اداس سی لگ رہی تھی۔

"جب سونو پیدا ہوا تھا آپ کو یاد ہے سسٹر! اس کے پپا۔۔۔" وہ نرس سے کہہ رہی تھی اور میں کاٹ میں پڑے بچے کو مسلسل تک رہا تھا۔

"ہاں یاد ہے۔" سسٹر پھر رونے لگی۔ عجیب عورت تھی پل میں روتی پل میں ہنستی۔ میں نے مڑ کر افرا علوی کو دیکھا۔ وہ شاید اس لیے اداس تھی کہ اس نے مجھے بہن کے لیے دعا کرنے کو کہا تھا اور میں نے بھائی کے لیے دعا کی تھی اور اللہ میاں نے میری دعا سن لی تھی۔

"مما! آپ اداس نہ ہوں۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تسلی دی۔ "میں اللہ میاں سے دعا کروں گا کہ وہ ایک بہن بھی دے دے آپ کو بھائی اچھا نہیں لگا۔"

"نو سوئٹ ڈیر! یہ تو بہت کیوٹ ہے۔"

افرا علوی کے بجائے نرس نے جواب دیا۔

[علوی] آنسو پونچھتی رہیں۔۔۔ اور نرس بھی روتی [ہن]ستی رہی میں کاٹ کے پاس کھڑا سوئے ہوئے [بھائی] کو دیکھتا رہا۔

"[مما] ہم اس کا کیا نام رکھیں گے۔"

نرس کے جانے کے بعد میں نے پوچھا۔

"تمہارا بھائی ہے "اللہ میاں نے تمہاری دعا پر بھیجا تھا اس لیے تم ہی اس کا نام رکھو۔"

"[نہ]یں۔" میری آنکھیں چمکنے لگیں۔ افرا علوی مجھے یکدم منتظر کر رہا تھا۔ "میں نے سوچا میں بھائی کا [نام ماجد] خان رکھوں گا۔ مجھے ماجد خان بہت اچھا لگتا [تھا اس] کا کھیل بھی۔"

[ج]ب ہم ٹیکسی میں بیٹھ رہے تھے تو سسٹر نے افرا [علوی] سے کہا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے گھر آیا کرے گی اور [افرا] علوی مسکرا دی تھی۔

"ضرور سسٹر! آپ ضرور آئیے گا۔ یوں بھی ہم [اکیلے رہ] گئے ہیں۔ آپ کا خلوص، آپ کی محبت ہمیں [ہمیشہ یاد] رہے گی۔"

[ہم] بہت خوش خوش گھر آئے تھے۔ میں سارا راستہ [بھ]ائی کو دیکھتا رہا۔ وہ افرا علوی کی گود میں گہری نیند سو رہا [تھا]۔۔۔ اور سوتے میں منہ بناتا۔ کبھی مسکراتا، کبھی [ر]ونے لگتا۔ لیکن شاید خوشیاں اب ہمیں راس [ن]ہیں آتی تھیں۔ خوشی حمید اللہ علوی کے ساتھ ہی [اس] گھر سے رخصت ہو گئی تھی جب ہم اپنے گھر کے سامنے پہنچے تو دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔

افرا علوی نے گھبرا کر مجھے دیکھا اور پھر بھائی کو [لے کر] تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی اور میں [بھی باسک]ٹ اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے چڑھنے لگا۔

[ٹی] وی لاؤنج کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ الماری کی درازیں کھلی تھیں۔ افرا علوی کچھ دیر ٹی وی لاؤنج کے درمیان کھڑی رہی۔ پھر اس نے بھائی کو صوفے پر [لٹایا] اور دیوانوں کی طرح سب کمرے دیکھ ڈالے۔

چور سب کچھ لے گئے تھے۔ لاکر سے تمام زیورات، نقد رقم، پرائز بانڈز، ٹی وی، فریج، اوون۔۔۔ سب [کچھ]۔۔۔ افرا علوی تھک کر رونے لگی اونچا اونچا۔

میری سائیکل جو حمید اللہ علوی میری برتھ ڈے پر گفٹ کرنے لائے تھے۔ وہ بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔

کچھ بھی تو نہیں بچا تھا۔۔۔ افرا علوی کی حالت خراب ہو گئی۔ وہ شاید بے ہوش ہو گئی تھی۔

"مما۔۔۔ مما!"

میں دیر تک اسے بلاتا رہا اور چلاتا رہا پھر روتا ہوا نیچے بھاگا۔ نجیب اللہ علوی لان میں کھڑا مالی سے باتیں کر رہا تھا۔

"پلیز انکل! میرے ساتھ چلیں اوپر میری مما بے ہوش ہو گئی ہیں یا شاید پپا کے پاس چلی گئی ہیں۔" یہ لفظ میں نے بمشکل ادا کیے تھے۔ تب مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ نجیب اللہ علوی سے میرا کیا رشتہ ہے۔

"تو میں کیا کروں؟"

وہ مالی کے ہاتھ سے پائپ لے کر گھاس پر پانی ڈالنے لگا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے بے بسی سے۔۔۔ میں ہونٹ کاٹتا ہوا واپس پلٹا تو مالی نے مجھے آواز دی۔

"سونو بیٹا! میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" نجیب اللہ علوی نے غصے سے اسے گھورا۔

لیکن مالی کچھ بڑبڑاتا ہوا میرے پیچھے چل پڑا۔ سیڑھیوں میں ہی مجھے ننھے بھائی کے رونے کی آواز آئی۔۔۔ میں بھاگتا ہوا اوپر پہنچا۔ افرا علوی آنکھیں کھولے بے حس سی ننھے بھائی کے رونے کی آواز سن رہی تھی۔

"مما بھائی رو رہا ہے۔"

افرا علوی کو آنکھیں کھولے دیکھ کر جیسے میرے اندر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ افرا علوی نے اٹھ کر بھائی کو گود میں لے لیا۔ اور روتے ہوئے مالی سے پوچھا۔

"بابا۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ سب کیسے ہوا۔ چور سب لوٹ کر لے گئے۔ حالانکہ گیٹ پر چوبیس گھنٹے چوکیدار ہوتا ہے۔"

"وہ بی بی! میں کیا بتاؤں؟" مالی نے نظریں چرالی تھیں۔ افرا علوی کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔

www.allurdu.com

"تم جانتے ہو' بابا! تمہیں پتا ہے کون چور ہے۔ کس نے چوری کیا سب کچھ۔۔؟"

تب ہی نجیب اللہ علوی بھی سیڑھیاں چڑھ کر ٹی وی لاؤنج میں آ گیا۔

"کیوں چیخ رہی ہو؟" اس کے لہجے میں تحقیر تھی۔

"کیوں نہ چیخوں۔۔۔ تم۔۔۔ یہ سب تم نے کیا ہے۔ یہ میرے گھر میں چوری تم نے کروائی ہے۔"

"تمہارا گھر۔" وہ تحقیر سے ہنسا۔ "یہ گھر ہمارا ہے۔ اور ہم جب چاہیں' تمہیں اس گھر سے دھکے دے کر باہر نکال دیں۔"

"نہیں۔۔۔ یہ گھر میرا ہے۔ میں یہاں بیاہ کر آئی تھی۔ حمید اللہ علوی مجھے بھگا کر نہیں لایا تھا۔ بے شمار لوگوں کی موجودگی میں آئی تھی یہاں۔۔۔"

"اچھا!" وہ پھر ہنسا۔

"یہ چوری تم نے کروائی ہے۔ میرے زیورات اور میری چیزیں کہاں ہیں۔ مجھے واپس کرو سب۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ یہ چوری میں نے کروائی ہے۔"

"ثبوت' مجھے یقین ہے۔" افرا علوی یکدم رونے لگی زور زور سے۔ "مت کرو ایسا میرے ساتھ۔ ہم پر رحم کھاؤ۔ یہ دونوں تمہارے بھائی ہیں۔ حمید اللہ علوی کے بیٹے ہیں۔ اس کی جائیداد میں برابر کے حصہ دار۔"

"ہماری جائیداد کے حصہ دار۔" اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "اس غلط فہمی میں مت رہنا اور دو دن کے اندر اندر اپنی اولاد کو لے کر نکل جاؤ یہاں سے۔"

"کہاں۔۔۔ کہاں جاؤں گی میں؟" افرا علوی کی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔

"ہاں' یہ سوچنے والی بات ہے کہاں جاؤ گی تم۔" وہ ابھی تک سیڑھیوں کے پاس ریلنگ کے پاس کھڑا تھا۔

"اپنے فلیٹ میں۔۔۔ جو اپنی اداؤں سے تم نے اپنے نام کروا لیا تھا۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔" وہ استہزائیہ سی ہنسی ہنسا۔

اس کے کاغذات تو چور اٹھا لے گئے ہوں گے وری سیڈ۔۔۔ چچ چچ۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر تمسخر سے افرا علوی کو کہا۔

"آپ کیسے ثابت کریں گی کچھ۔۔۔"

یکدم ہی اس کے چہرے کے نقوش کرخت ہو گئے اور لہجے میں تلخی آ گئی۔

"تم نے سنا افرا علوی! دو دن بعد میں تمہیں یہاں نہ دیکھوں۔"

"نہیں نہیں' جاؤں گی میں' کبھی نہیں' مر کر بھی تم مجھے یہاں سے نکال نہ سکو گے۔"

افرا علوی ایک ہاتھ میں بچے کو سنبھالتے ہوئے نجیب اللہ علوی کی طرف بڑھی تھی اور ایک ہاتھ سے اسے دھکیلنے لگی۔

"جاؤ' نکل جاؤ یہاں سے۔ میں حمید اللہ علوی کی بیوی ہوں۔ شرعاً اور قانوناً جائز بیوی۔"

"اچھا!" نجیب اللہ علوی نے تمسخر سے یوں ہی اس کی طرف جھکتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "تم مجھے یہاں سے نکل جانے کو کہہ رہی ہو تم؟"

اس نے اس کے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔۔۔ پھر نہیں کیسے منا بھائی افرا علوی کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔۔۔ پتا نہیں اس نے ہی بے دھیانی میں اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھایا تھا یا اس کی گرفت کمزور تھی کہ جھٹکے سے وہ ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ میں نے تو صرف یہ دیکھا تھا کہ منا بھائی لڑھکتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے جا رہا تھا۔۔۔ افرا علوی وحشت سے آنکھیں کھولے کھڑی تھی جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔ میں زور سے چیخا تھا اور سیڑھیوں کی طرف لپکا تھا اور میری چیخ نے افرا علوی کا سکتہ توڑ دیا تھا۔ وہ بھی ایک ہاتھ سے نجیب اللہ کو دھکا دے کر وحشت سے چیختی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگی تھی۔ میں وہ اور میرے پیچھے مالی بابا ہم سب تقریباً ایک ساتھ ہی نیچے پہنچے تھے۔ منا بھائی اللہ کے پاس جا چکا تھا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون نکل رہا تھا۔ افرا علوی نے اسے ایک دم اٹھا کر سینے سے بھینچ لیا۔ لیکن یکدم اسے زور سے ہچکی آئی تھی اور اس کے منہ سے خون نکلا تھا ڈھیر سارا۔

مالی بابا سر جھکائے کھڑے تھے۔ نجیب اللہ علوی نے ایک نظر افرا علوی اور اس کی گود میں پڑے منا بھائی پر ڈالتا ہوا گزر گیا۔ مجھے ادراک ہو گیا تھا خود بخود کہ کہیں کچھ غلط ہو گیا ہے۔ منا بھائی چلا گیا ہے۔۔۔ اس دن سے میں نے نجیب اللہ علوی کے لیے اتنی نفرت محسوس کی اتنی نفرت کہ اس نفرت سے آج تک میرا اندر زہریلا ہو رہا ہے۔ حمید اللہ علوی کے جانے کے بعد یہ دوسرا بڑا نقصان ہوا تھا میرا۔۔۔ مجھے لگتا ہے وجود میں آگ سی دہک اٹھی تھی۔ اب بھی جب میں اس منظر کو ذہن میں لاتا ہوں آخری سیڑھی کے پاس گود میں منے بھائی کو لیے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کے زخمی وجود کو تکتے ہوئے سکتے کی حالت میں بیٹھی ہوئی افرا علوی تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں ساری دنیا کو توڑ پھوڑ کر رکھ دوں۔ میں ہوا میں باؤلنگ اور بیٹنگ کرتا ہوں۔۔۔ اور میرے سامنے ماجد خان آ جاتا ہے۔ منا بھائی جسے ماجد خان بننا تھا' لیکن جسے۔۔۔ افرا علوی مجھے سمجھایا کرتی تھی "وہ اتنی ہی زندگی لے کر آیا تھا۔" شاید اس نے سوچا ہو کہ اس کے بابا وہاں اکیلے ہوں گے۔ "یہاں تو تم ہو نا میرے پاس۔"

لیکن مجھے اس کی بات سے اتفاق نہ تھا۔

میں کرکٹ کے میچ نہیں دیکھتا کیونکہ ان بچوں میں ماجد خان نہیں ہو گا۔ جسے میری دعا پر اللہ میاں نے میرے لیے بھیجا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

نجیب اللہ علوی نے جو کہا تھا وہ سچ کر دکھایا تھا اور ہمیں اس گھر سے نکال دیا تھا۔ کچھ دن ہم اسی نرس کے کوارٹر میں رہے تھے۔ وہ پل میں روتی اور پل میں ہنستی تھی۔ پھر افرا علوی نے ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کر لی اور ایک چھوٹا سا گھر لے کر رہنے لگے۔۔۔ وہ صبح مجھے اسکول چھوڑتی اور پھر اپنے اسکول چلی جاتی۔ چھٹی کے وقت وہ مجھے وہاں سے لے لیتی۔ لیکن نہ تو مجھے یہ گھر پسند تھا اور نہ ہی اس مسافر وین میں بیٹھ کر اسکول جانا پسند تھا۔ اسکول وین سے مما نے میرا نام کٹوا دیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ مما کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔ مجھے یہ بھی پتا تھا کہ چوروں نے سب کچھ چوری کر لیا ہے۔ اور ان چوروں کو نجیب اللہ علوی نے بھیجا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں بہت چپ چپ اور اداس رہنے لگا تھا۔

پھر ایک دن مما نے مجھ سے کہا کہ اب وہ مجھے کسی اور اسکول میں داخل کروا دیں گی۔

"نہیں' میں کسی اسکول میں نہیں جاؤں گا۔ میں یہاں ہی پڑھوں گا۔"

میں نے ضد کی اور مچل مچل کر رونے لگا' حالانکہ میں اس حقیقت کا ادراک رکھتا تھا کہ یہ افرا علوی کی مجبوری ہے۔ میں جانتا تھا کہ کل شام افرا علوی نے مجھے تھوڑے سے آملیٹ کے ساتھ روٹی دی تھی اور خود قہوے کے ساتھ روٹی کھائی تھی۔ پھر بھلا اس اتنے مہنگے اسکول کی فیس وہ کہاں سے دے سکتی تھی۔ پھر بھی میں مچل مچل کر رو رہا تھا۔۔۔ رونا دراصل اسکول تبدیل کرنے پر نہیں تھا۔۔۔ یہ بہت ساری دوسری باتوں کا رونا تھا۔ بہت سارے آنسو جو بہت دنوں سے میرے اندر جمع ہو گئے تھے آج اس بہانے بہہ نکلے۔

اس روز میں اتنا رویا کہ مجھے بخار ہو گیا اور افرا علوی پریشان ہو گئی۔

مجھے دو دن تک شدید بخار رہا اور میں بہانے بہانے روتا رہا۔۔۔ میرے اندر جو بہت سارا رونا اکٹھا ہو گیا تھا۔۔۔ وہ سب آنسو میں نے بہا دیے۔ میں جو بہت صابر بچہ تھا۔ افرا علوی آنکھوں میں آنسو بھرے مجھے دیکھتی۔

"سونو! تم نے تو کبھی ضد نہیں کی تھی میری جان! مما کی مجبوری کو سمجھو۔"

میں اس کی مجبوری سمجھتا تھا' لیکن میں ان آنسوؤں کا کیا کرتا جو اندر ہی اندر جمع ہو کر دریا بن گئے تھے' انہیں کسی نہ کسی صورت تو بہنا ہی تھا۔۔۔ سو میں دو دن وقفے وقفے سے روتا رہا۔۔۔ پھر دو دن بعد میرا بخار اترا' اگلے دو روز تک کمزوری بھی جاتی رہی۔

www.allurdu.com

اور افزا علوی نے مجھ سے کہا کہ میں تیار ہو جاؤں وہ مجھے اسکول چھوڑ دے گی۔

"نہیں مجھے اسکول نہیں جانا۔ میں گھر میں ہی آپ سے پڑھ لوں گا۔"

"لیکن تم تو اسکول نہ چھوڑنے کے لیے اتنا رو رہے تھے۔ میں نے سوچا ہے میں کچھ ٹیوشن بھی کرلوں گی۔ تمہاری سسٹر آنٹی نے مجھے کچھ ٹیوشن دلوانے کا وعدہ کیا ہے۔"

"نہیں آپ ٹیوشن نہ کریں۔ اس اسکول سے آکر میرے پاس رہا کریں۔ اور مجھے پڑھایا کریں۔ بلکہ آپ مجھے اپنے ساتھ ہی اسکول لے جایا کریں اپنے والے اسکول میں وہاں تو فیس تھوڑی ہوگی نا۔"

افزا علوی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"لیکن تم تیار تو ہو جاؤ نا" تمہارا سرٹیفکیٹ لینا ہے۔"

اور پھر ہم امریکن گرامر اسکول میں آگئے سرجان ہمیں اسکول میں جاتے ہی مل گئے تھے۔

"ہیلو وائے کہاں چلے گئے تھے؟"

"سر میں بیمار تھا۔"

میں نے جواب دیا اور افزا علوی کا تعارف کروایا۔

"یہ میری مما ہیں۔"

"آپ کا بیٹا بہت خوبصورت اور ذہین ہے۔ یہ بہت آگے جائے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ اس اسکول کا نام روشن کرے گا۔"

افزا علوی نے سر جھکا لیا تھا۔

ساری بات سن کر سرجان کچھ دیر خاموش کھڑے رہے افسردہ سے۔

"ہوں کی فیس ہاف ہو سکتی ہے۔"

"لیکن اس اسکول کی ہاف فیس بھی میرے لیے بہت زیادہ ہے۔"

"ٹھیک ہے" انہوں نے جیسے فیصلہ کیا۔ "باقی کی ہاف فیس میں اپنی جیب سے ادا کروں گا۔"

افزا علوی نے اور میں نے بھی بہت انکار کیا۔ لیکن انہوں نے بہت اصرار کیا۔

"یہ ادھار ہے جب یہ بڑا ہو کر کسی مقام پر پہنچ گیا ادھار اتار دے گا۔"

اور میں نے دل ہی دل میں سوچ لیا تھا کہ اگر افزا علوی نے سرجان کی بات مان لی تو میں بڑا ہو کر سرجان کا سارا ادھار چکاؤں گا اور افزا علوی نے سرجان کی آفر قبول کر لی تھی۔۔۔ اس روز گھر واپس آتے ہوئے میں نے کہا۔

"مما! آپ کمال انکل، جمال انکل کے پاس کیوں نہیں جاتیں۔ کیا وہ ہمیں نہیں رکھیں گے۔"

"نہیں۔۔۔ وہ تو بہت خوش ہوں گے۔ کمال تو خوشی سے ناچنے لگے گا۔ اور۔۔۔ لیکن۔"

"لیکن۔۔۔ کیا؟"

"ہمیں یہ جو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں۔"

"وہ جو ان کا پرانا گھر تھا۔ وہاں جا کر پتا کرسکتے ہیں شاید کسی کو پتا ہو۔" میں نے مما سے کہا۔

مجھے اپنی تو فکر نہ تھی مجھے افزا علوی کی فکر تھی کہ وہ روز بروز پیلی ہوتی جارہی تھی۔ چپکے چپکے روتی تھی۔ مجھے دودھ کا کپ دیتی اور خود چھپ کر بغیر دودھ کے چائے پیتی تھی۔

"اچھا چلیں گے کسی روز۔"

اس وقت افزا علوی نے مجھے ٹال دیا تھا۔ مگر پھر ایک دن جب وہ اسکول سے آکر بہت روئی تھی۔ جانے کیا بات ہوئی تھی شاید اس کے اسکول کے پرنسپل نے اسے ڈانٹا تھا یا پتا نہیں کیا لیکن اس روز اس نے سسٹر آنٹی سے کہا تھا کہ وہ اس کے لیے کسی اور جگہ نوکری کا بندوبست کریں۔

سسٹر نے تھوڑا ہنس کر اور تھوڑا رو کر اسے تسلی دی تھی کہ وہ پہلے ہی کوشش کررہی ہے کسی اچھی اور بہتر جاب کے لیے تب اس روز سسٹر کے جانے کے بعد افزا علوی نے مجھ سے کہا۔

"سونو بیٹا! آؤ تمہارے جمال ماموں اور کمال ماموں کو تلاش کریں۔"

اور پھر افزا علوی کے ساتھ پہلی بار میں نے وہ گھر دیکھا جہاں اس نے اپنی زندگی کے بہت سارے سال

www.allurdu.com

گزارے تھے۔۔۔۔ یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت گھر تھا۔۔۔۔

"شہباز کی عادت تھی کہ اکثر یہاں سے گیٹ پر سے کود کر آجاتا تھا۔۔۔۔ وہ بھی بیل نہیں بجاتا تھا۔"

افزا علوی کی آنکھوں میں اور لہجے میں بڑی جنوں والی محبت کے رنگ تھے۔ یہ گھر جن لوگوں نے خریدا تھا انہیں علم نہ تھا کہ گھر کے مالک کہاں گئے تھے۔ آس پاس کے کئی گھروں میں ہم لوگ گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو افزا علوی کو جانتے تھے۔ اور ان کے جمال ماموں وغیرہ سے اچھے تعلقات تھے۔ انہوں نے افزا سے افسوس کیا۔ ہمدردی بھی کی لیکن کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ لوگ یہاں سے کس شہر میں گئے تھے۔ اکثر نے حیرت کا بھی اظہار کیا کہ جن لوگوں نے بیٹی کی طرح رکھا شادی کی پھر شادی کے بعد خبر تک کیوں نہ لی۔ بلکہ انہیں ظالم قرار دیا جنہوں نے اپنے بیٹی مروالے اور تین بچوں کے باپ سے شادی کر دی۔

اس روز میں پہلی بار مایوس ہوا ورنہ میں سوچتا تھا کہ جمال اور نہال ماموں بھی نہ کبھی ضرور آئیں گے اور پھر ہم مل کر نجیب اللہ سے بدلہ لیں گے۔ پپا کا اور بھائی کا۔۔۔۔ اس روز رات کو جب میں بستر پر لیٹا تو میری سوچ کا رنگ تھوڑا بدل گیا تھا۔ میں دل ہی دل میں نجیب اللہ علوی سے اکیلے ہی نپٹنے کے منصوبے بنا رہا تھا اور خواب میں میں نے اسے سیڑھیوں سے لڑھکتے اور پھر آخری سیڑھی کے پاس بالکل پاپا کی طرح میں دل ہی دل میں اسے ملی کہ گرایا تھا۔ ہاں تو میں نے خواب میں پاپا کی طرح خون کی قے کرتے دیکھا تھا اور آنکھیں بند کیے بے بس پڑے ہوئے اس کے منہ سے اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

نرس آنٹی تھیں جو کبھی کبھی آتی تھیں انہوں نے کئی بار افزا علوی کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کیس کردیں اپنے اور اپنے بیٹے کے حصے کے لیے۔۔۔۔ یا پھر اپنے فلیٹ کے لیے جو عبداللہ علوی نے شادی سے پہلے ہی اس کے نام کردیا تھا۔

لیکن افزا علوی کہتی۔۔۔۔

"میں تنہا عورت اس معصوم بچے کے ساتھ کیا کروں۔ میں نے اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا ہے۔"

لیکن میں نے سوچ رکھا تھا کہ ذرا بڑا ہو جاؤں تو نرس آنٹی سے پوچھ کر نجیب اللہ علوی پر کیس کروں گا۔ اپنے بھائی کے قتل کا۔۔۔۔ اور نجیب اللہ علوی کو پھانسی پر لٹکا دوں گا۔

♥ ♡ ♡ ♥

لیکن تقدیر میرے خوابوں پر ہنس رہی تھی میں جب گیارہ سال کا ہوا تو افزا علوی ایک رات جو سوئی تو پھر صبح نہ اٹھ سکی۔ اس روز اس کی طبیعت صبح سے ہی خراب تھی اس نے پڑوس سے فون کرکے نرس آنٹی کو بلایا تھا اور بہت دیر تک چپکے چپکے اس سے باتیں کرتی رہی تھی۔ نرس آنٹی نے آتے ہی ڈاکٹر سے دوا بھی لا کر دی تھی جسے اس نے یونہی ٹیبل پر رکھ دیا تھا اور اس رات ہمیشہ کی طرح سونے سے پہلے جب اس نے میری پیشانی چومی تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے جسے اس نے انگلی کی پوروں سے صاف کرلیا تھا۔۔۔۔ اور مجھے اپنے پاس بٹھا کر بہت دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہی تھی۔ پپا کی اور جمال انکل کی نہال انکل کی۔ اور اس نے مجھے کہا تھا۔

"بیٹا اگر کبھی اکیلے رہ جاؤ تو بہادر بننا۔ اور پڑھائی کبھی مت چھوڑنا۔ میری بڑی شدید خواہش ہے کہ تم ایک روز بہت زیادہ پڑھ لکھ کر بہت بڑے آدمی بنو۔"

"مما! کیا آپ کہیں جا رہی ہیں مجھے چھوڑ کر۔"

میں سہم گیا تھا حالانکہ تب میں گیارہ سال کا ہو چکا تھا۔

"بچے کو کیوں پریشان کرتی ہو افزا۔"

نرس آنٹی نے جو اس رات ہمارے گھر ہی رک گئی تھی۔ افزا علوی کو ڈانٹ دیا۔

"میں نے ڈاکٹر عابد سے بات کرلی ہے۔ کل ہم دونوں صبح چلیں گے۔۔۔۔ صبح میرا آف ہے۔ وہ بہت بڑے ہارٹ اسپیشلسٹ ہیں۔"

"کیا مما کو ہارٹ کی تکلیف ہے سسٹر؟" میں

پریشان ہو گیا تھا۔

"پتہ نہیں۔ صبح ڈاکٹر صاحب کو دکھائیں گے تم اپنی مما کے لیے دعا کرنا سونو۔۔۔۔"

نرس آنٹی نے کہا اور مما نے مجھے بلایا۔

"سونو آج تو ادھر میرے پاس ہی لیٹ جاؤ بیٹا۔"

اور میں مما کا ہاتھ پکڑ کر سو گیا اور پھر جانے کب سوتے میں مما کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو ہمارے گھر کے چھوٹے سے صحن میں کچھ عورتیں کھڑی تھیں اور اونچی اونچی باتیں کر رہی تھیں۔ مما نے سر سے پیر تک چادر اوڑھی ہوئی تھی مجھے اٹھتے دیکھ کر نرس آنٹی دوڑتی ہوئی اندر آئی اور اس نے مجھے گلے لگا لیا اگرچہ میری عمر گیارہ سال تھی لیکن میرا قد نرس آنٹی سے ذرا سا ہی چھوٹا تھا۔

"سونو۔۔۔۔ سونو تمہاری مما چلی گئیں۔"

"کہاں؟" میں نے نرس آنٹی کی طرف دیکھا۔

"تمہارے پپا کے پاس۔"

اور اونچا اونچا رونے لگی لیکن میں ساکت کھڑا تھا۔ میری آنکھیں خشک تھیں بالکل خشک۔ میں بہت دیر تک یونہی ساکت کھڑا رہا پھر نرس آنٹی نے اپنے آنسو پونچھے اور مجھے بانہوں میں لے لیا لیکن میں آہستگی سے اس کی بانہوں سے نکل گیا۔

میں ہولے ہولے چلتا ہوا افزا علوی کے بیڈ تک گیا اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ ناک کے قریب سے نیلا ہو رہا تھا۔ میں لمحہ بھر یونہی اس کے بند ہونٹوں بند آنکھوں کو دیکھتا رہا۔

"مما! یہ آپ نے مجھ سے اچھا نہیں کیا۔ بالکل اچھا نہیں کیا؟"

میرے اندر سے آواز اٹھی تھی لیکن میرے ہونٹ بند تھے۔ میں ان سے ناراض اور خفا سا ہو رہا تھا۔۔۔۔ یہ انصاف تو نہیں کیا تھا مما نے میرے ساتھ مجھے اس بھری دنیا میں تنہا چھوڑ کر خود پپا کے پاس چلی گئی تھیں۔ میرے اندر غصہ بڑھتا گیا اور رنج بھی ہوا ہو گیا۔ میرے آنسوؤں اور سسکیوں نے میرے اندر جیسے طوفان بپا کر دیا تھا لیکن میری آنکھیں خشک تھیں۔ نرس آنٹی نے آگے بڑھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"سونو بیٹے! یاد ہے رات مما نے آپ سے کیا کہا تھا کہ آپ ایک بہادر بچے ہو۔"

"میں بہادر بچہ نہیں ہوں۔" افزا علوی کو جانے کیوں یہ غلط فہمی تھی کہ میں بہادر ہوں۔۔۔۔ "میں بہادر نہیں ہوں مما۔"

میں نے دل ہی دل میں شکوہ کیا لیکن میری زبان خاموش تھی اور ہونٹ سختی سے ایک دوسرے سے بھنچے ہوئے تھے۔ میں نے ایک بار پھر غور سے مما کے چہرے کو دیکھا۔ ہونٹوں سے نیچے بھی جگہ ہلکی سی نیلی تھی۔

"نجیب اللہ علوی۔"

میری کنپٹیاں گرم ہو گئیں اور خون رگوں میں کھول اٹھا۔ "کیا مما کو کسی نے مارا ہے؟" میرا لہجہ سپاٹ تھا اور میری سوالیہ نظریں نرس آنٹی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

"تت۔۔۔۔ نہ میری جان بھلا کس نے مارنا تھا؟ آپ کی مما کو بہت سیویر Severe ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ اور جب کوئی بڑا ہارٹ اٹیک ہو تو اس طرح کہیں کہیں سے جسم نیلا ہو جاتا ہے۔"

میں بغیر جواب دیے پھر مڑ کر افزا علوی کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"مما آپ کتنی ظالم ہیں" میرے لب ذرا سے کھلے تھے۔ اور میرے اندر سے کوئی گرم سیال جیسے ایک تیز لہر کی صورت آنکھوں کی سمت بڑھا اور میں بھاگتا ہوا وہاں سے باہر چلا گیا اور اسٹور میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ باہر نرس آنٹی کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"سونو۔۔۔۔ سونو بیٹا! کہاں چلے گئے ہو۔"

پھر دوسری خواتین کی بھن بھن کی آواز۔

"بچے کو اس وقت نہ چھیڑیں۔۔۔۔ بہت اپ سیٹ ہوا ہے۔ اسے اپنے حال پر چھوڑ دو۔"

"باہر تو نہیں چلا گیا۔" آنٹی نرس کی آواز۔

"نہیں ادھر اسٹور میں گیا ہے۔"

کسی نے جواب دیا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

میں اسٹور کے فرش پر بیٹھ گیا۔ اور گرم پانی کا سیلاب میری آنکھوں سے بہ نکلا۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی ــــ باہر عورتوں کے چلنے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ لیکن میں یونہی بیٹھا رہا۔ میرا جی چاہ رہا تھا میں افزا علوی سے جا کر لڑوں ــــ اس نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا ــــ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔

رات نرس آنٹی نے مجھے زبردستی کچھ کھلانے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے کچھ نہیں کھایا تھا ــــ میں ساری دنیا سے خفا ہو گیا تھا۔

"تمہاری مما کو سال بھر پہلے ہارٹ کی تکلیف ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر عابد نے انہیں ریسٹ کرنے کی اور ٹینس نہ ہونے کی تلقین کی تھی۔ لیکن تین ہزار تنخواہ میں وہ مکان کا کرایہ اور گھر کا خرچ ہی بمشکل پورا کرتی تھیں۔ اپنی میڈیسن کہاں سے لیتیں ــــ" نرس نے مجھے بتایا تھا۔

"اگر انہیں میرا خیال ہوتا تو مجھ سے کہتیں۔ ہم بھوکے رہ لیتے اور ان کی دوائیں آسکتی تھیں ــــ لیکن انہیں میرا خیال نہیں تھا اسی لیے چھوڑ کر چلی گئیں۔"

میں نے سوچا اور گرم گرم آنسوؤں سے میرا حلق بھر گیا۔

تین دن بعد نرس آنٹی نے مجھ سے پوچھا تھا۔

"سنو ــــ میری جان کیا تم نے سوچا ہے کہ تم اب کہاں رہو گے؟"

یہ تو افزا علوی کو سوچنا چاہیے تھا کہ میں اب کہاں رہوں گا۔ اگر وہ سوچتی یہ تو کبھی بھی مجھے یوں چھوڑ کر نہ جاتی ــــ

میرے اندر پھر ایک گرم پتیوں کا سیلاب اٹھا جس نے مجھے اندر باہر سے جل تھل کر دیا۔ نرس آنٹی نے مجھے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔ میری پیشانی پر میرے سر پر میری آنکھوں پر بہت پیار کیا۔ اور مجھے بتایا۔

"سنو! آپ کی مما نے کہا تھا کہ میں آپ کو آپ کے پاپا کے گھر آپ کے بھائیوں کے پاس چھوڑ آؤں۔"

اب جبکہ میں گیارہ سال کا تھا تو یہ جان چکا تھا کہ نجیب اللہ اور مجیب اللہ علوی میرے سوتیلے بھائی ہیں۔ مجھے مما کی اس بات پر از حد حیرت ہوئی۔ نجیب اللہ علوی نے مما کا ہاتھ جھٹکا تھا اور مما ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں کی نفرت اور لہجے کی حقارت یاد آئی تو میرا وجود کانپ گیا۔ انہوں نے ہمیں اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ بھلا مجھے وہاں کیسے رکھیں گے۔

"اور اگر میں وہاں نہ رہنا چاہوں اور آپ کے ساتھ رہوں تو؟" میں نے پوچھا۔

نرس آنٹی کو شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی طلاق ہو گئی تھی اور ان کی اولاد نہ تھی بس ایک بوڑھی ماں تھی جو گاؤں میں بیٹے کے پاس رہتی تھی۔ بیٹے کو ان کا نرس بننا پسند نہ تھا اور نرس آنٹی کو بھائی کی بیوی کی گالیاں سننا اور دن بھر گھر کے کام کرنا سو انہوں نے کچھ عرصہ بڑی بھلی بننے کے بعد نرسنگ کا کورس کر لیا تھا اور سال ہاسپٹل میں ملازمت اختیار کر لی تھی اور کبھی کبھار ہی گاؤں جاتی تھیں ماں سے ملنے۔ نرس آنٹی اچھی تھیں۔

"تو میری جان سنو اب بھی تمہیں وہاں ہی رہنا ہے۔ یہ تمہاری مما کا حکم ہے ــــ میں نے کہا تھا افزا سے کہ میں تمہیں اپنی جان سمجھوں گی ــــ اور افزا کی طرح ہی تمہارا خیال رکھوں گی لیکن اس نے کہا اپنے بھائی کی جائیداد میں تم بھی برابر کے حصہ دار ہو اور تمہیں وہاں رہ کر اپنا حق لینا ہے۔"

اگر افزا مجھے علوی ہاؤس میں رہنے کا حکم نہ دیتی تو میں مزے سے نرس آنٹی کے پاس رہتا اور اس کی گلیوں کی چھاؤں میں پلتا اور ایک نارمل آدمی کی طرح ہوتا۔ میری ذات میں اتنی گرہیں نہ ہوتیں ــــ مجھے دنیا اتنی قابل نفرت نہ لگتی ــــ میرا دل یوں دنیا کو اپنے پاؤں تلے کچل دینے کو نہ چاہتا۔ میرا وجود اتنا زہریلا نہ ہوتا اور میں ــــ میں اوج کے ساتھ وہ سب کچھ نہ کرتا جو میں نے کیا ہے۔ لیکن افزا علوی نے حکم دیا تھا سو نرس آنٹی نے مجھے تیار ہونے کو کہا۔

"مجھے کل دبئی پر جانا ہے۔ اس لیے میں آج ہی تمہیں لے کر علوی ہاؤس جاؤں گی ــــ اور پھر ــــ میں نے تمہاری کتابیں اور دوسری ضروری اشیا رکھ لی ہیں باقی چیزوں کے متعلق بعد میں سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ پہلے ہم قبرستان جائیں گے۔"

اس نے بتایا۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا تھا۔ اور جب تک وہ تیار ہوتی رہی۔ میں افزا علوی کی چیزیں دیکھتا رہا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر برش تھا جس میں افزا علوی کے بال الجھے ہوئے تھے۔

شاید اس کی طبیعت خراب تھی اس لیے اس نے برش کر کے برش یونہی ڈریسنگ ٹیبل پر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے احتیاط سے بال برش سے نکال لیے اور پاکٹ میں رکھ لیے۔ اور اس کا وہ برش بیڈ پر تکیے کے ساتھ پڑا تھا اٹھا کر سونگھنے لگا۔ نرس آنٹی نے مجھے دیکھا۔

"اگر تمہارے بھائیوں نے تمہیں رکھ لیا تب تو میں نہیں جانتی کہ وہ اس سامان کا کیا کریں گے لیکن اگر تم مجھے مل گئے تو ہم یہ سامان فروخت کر دیں گے۔ یہ کافی قیمتی فرنیچر ہے اور روپے تمہارے نام سے بینک میں جمع کروا دوں گی۔ اور اپنی مما کی دوسری استعمال کی اشیا تم اپنے پاس رکھ لینا ان کی یاد کے طور پر۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میرے اندر ایک گہری چپ اتر آئی تھی اور لمحہ بہ لمحہ یہ چپ زیادہ گہری ہوتی جارہی تھی حتیٰ کہ جب میں نرس آنٹی کے ساتھ قبرستان گیا اور وہاں مٹی کے اس ڈھیر کو دیکھا جس کے نیچے افزا علوی کا خوبصورت وجود چھپ گیا تھا تب بھی چپ رہا۔ میں نے قبر کی مٹی پر ہاتھ رکھا تو میرے اندر مجھے ذرا سا سکون آیا لیکن میں باہر سے پرسکون تھا اور میں نے تقریباً سرگوشی میں کہا تھا۔

"مما میں آپ سے ناراض ہوں۔ مما آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔"

"بری بات۔" نرس آنٹی نے سن لیا۔ "تمہاری مما اپنی خوشی سے نہیں گئی ہیں اور کوئی بھی اپنی خوشی سے نہیں جاتا ــــ لیکن وقت پورا ہو جائے تو جانا ہی ہوتا ہے۔"

کھانا پکانے اور کھانے کے شائقین کے
لیے ایک نئی کتاب
عالمی شہرت یافتہ سنجیو کپور کا
ٹیلی ویژن پروگرام کی منتخب ترکیبیں کتابی شکل میں
کھانا خزانہ
اردو زبان میں پہلی بار
نئی ترکیبیں، نیا انداز، آسان ترکیبیں
خوبصورت چھپائی کے ساتھ
16 رنگین تصاویر، بڑا سائز، آج ہی
قریبی بک اسٹال سے حاصل کریں
یا منی آرڈر / بینک ڈرافٹ ارسال
کریں، پیکنگ وغیرہ فری
قیمت صرف =/250 روپے
خط لکھیں یا آرڈر دیں دستی حاصل کرنے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار کراچی فون 2216361

www.allurdu.com

میرا دل چاہا کہ میں مٹی اکھیڑ ڈالوں اور مما کو باہر نکال لوں اور ان کے ساتھ لپٹ جاؤں اور میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا اور کھڑا ہو گیا۔

"چلیں؟"

"ہاں!"

دعا مانگ کر نرس آنٹی بھی کھڑی ہو گئی۔

مما نے شاید علوی ہاؤس کا پتا بہت اچھی طرح نرس آنٹی کو سمجھا دیا تھا کہ ٹیکسی سیدھی علوی ہاؤس کے گیٹ کے پاس جا کر رکی تھی۔

لاؤنج میں صرف اسارہ علوی تھی جو ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

"مجھے مسز حمید اللہ علوی سے ملنا ہے۔" نرس نے اسے مخاطب کیا۔

"آپ کون ہیں؟" اسارہ علوی نے پوچھا اور ایک اجنبی نظر مجھ پر ڈالی۔ شاید اتنے سالوں بعد وہ مجھے پہچان نہ سکی تھی۔

"آپ مسٹر علوی کی صاحبزادی ہیں؟"

نرس نے جواب دینے کے بجائے پوچھا تو اسارہ نے سر ہلا دیا تو نرس آنٹی نے کہا۔

"بیٹا! آپ کی والدہ مجھے ذاتی طور پر نہیں جانتیں اور میں بھی غائبانہ ان سے متعارف ہوئی ہوں' مجھے ایک ضروری کام ہے ان سے۔"

اسارہ رقیہ علوی کو بلانے چلی گئی۔

رقیہ علوی پہلے تو نرس آنٹی کی بات سن کر غصے میں آ گئی۔

"ہم کسی افزا کو نہیں جانتے۔"

پھر اس نے ایک تیز غصیلی نظر مجھ پر ڈالی۔ "یہ اس کا بیٹا ہے؟"

"صرف اس کا ہی نہیں حمید اللہ علوی کا بھی ہے۔"

نرس آنٹی نے آہستگی سے کہا۔

اور پھر بہت دیر تک دونوں کے درمیان گفتگو ہوتی رہی ۔۔۔۔ کبھی کبھی آواز بلند ہو جاتی کبھی آہستہ۔ لیکن میں نے ان کی گفتگو سننے کی کوشش نہیں کی۔

میں شاید کچھ دیر کے لیے گردوپیش سے بے خبر ہو گیا تھا۔ میرے سامنے ٹی۔وی لاؤنج کے بیچوں بیچ حمید اللہ علوی گرے پڑے تھے اور آس پاس کھڑے اسارہ علوی اور نجیب اللہ علوی چیخ رہے تھے۔ رقیہ علوی تھی جو بین کر رہی تھی اور افزا علوی تھی جو گھٹنوں کے بل حمید اللہ کے ساکت جسم پر ہاتھ رکھے دھواں دھار رو رہی تھی ۔۔۔ بعض منظر کیسے ذہن میں منجمد ہو جاتے ہیں اور کبھی پگھلتے نہیں۔ کبھی مٹتے نہیں۔ پھر نجیب اللہ علوی کی آمد مجھے اس منظر سے باہر لائی۔ وہ اونچی آواز میں رقیہ علوی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ جواب میں رقیہ علوی نے کچھ کہا شاید میرے اور افزا علوی کے متعلق بتایا تھا۔

"چلیں جان چھوٹی۔" ہاتھ جھاڑتے ہوئے اس نے یوں کہا جیسے افزا علوی اس کے لیے کوئی مسلسل بوجھ تھی۔ پھر ایک حقارت بھری نظر مجھ پر ڈالی۔ اور عجیب طرح انداز میں مسکرایا اور غصیلی آواز میں نرس کو مجھے واپس لے جانے کو کہا۔

"جاؤ' جا کر کسی یتیم خانے میں ڈال دو۔"

اور میں نے اپنے اندر ایک طمانیت سی محسوس کی۔ شاید میں بہت دیر سے کسی ایسے ہی فیصلے کا منتظر تھا۔

اب مجھے نرس آنٹی کے پاس رہنا ہے جو ہل میں ہستی اور ہل میں رہتی تھی۔ اور وہاں رہنا یہاں اس اتنے بڑے علوی ہاؤس میں رہنے سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ اور یوں بھی مجھے یہاں رہنے والوں سے خوف آتا تھا۔

میں نے کھڑے کھڑے نرس آنٹی کی طرف دیکھا اور کہا۔

"آیئے!" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو" میں نے دیکھا اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور خوشی اس کی آنکھوں سے جھلکی پڑتی تھی۔

اس نے افزا علوی کے ساتھ کیا ہوا وعدہ نبھا دیا تھا اور مجھے یہاں لے آئی تھی۔ ان لوگوں نے مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھا تھا۔ لہٰذا اب وہ آزاد تھی کہ مجھے اپنے

ساتھ رکھ سکے۔ میں آگے بڑھا تو نجیب اللہ علوی نے جان بوجھ کر ایک پاؤں آگے بڑھایا اور میں ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ میری ناک نیچے کارپٹ پر لگی اور اس سے خون کے قطرے بہنے لگے۔ نرس آنٹی نے فوراً اپنے دوپٹے سے میری ناک سے بہنے والے خون کو پونچھا اور خشمگیں نظروں سے نجیب اللہ علوی کو دیکھا جو انجان سا بنا کھڑا تھا۔ اس دن میں نے اپنے اندر نفرت کی ایک آگ سی بھڑکتی محسوس کی اور یہ نفرت نجیب اللہ علوی کے لیے تھی۔

"آج رات ہم اسی گھر میں رہیں گے۔ میں صبح ڈیوٹی پر جاؤں گی تو تم اسکول چلے جانا۔ میں تمہارے سر جان سے کہہ دوں گی کہ تم کو میرے آنے تک وہاں ہی رکھیں۔ تم چھٹی کے بعد سرجان کے کوارٹر میں چلے جانا۔ تمہاری مما چند دن پہلے سرجان سے ملی تھیں اور انہوں نے تمہارے متعلق ان سے بہت ساری باتیں کی تھیں اور تم سے کہا تھا کہ تم ہمیشہ وہی کرنا اور وہی کرنا جیسا کہ سرجان تم سے کہیں۔ سرجان نے تمہاری مما سے وعدہ کیا ہے کہ جب تک وہ یہاں ہیں پاکستان میں وہ تمہاری تعلیم کا پورا خیال رکھیں گے۔ بلکہ انہوں نے ہمیشہ کے لیے تمہاری تعلیمی ذمہ داری کو قبول کیا تھا۔"

میں غم زدہ تھا' افسردہ تھا۔ لیکن اس بات سے مطمئن بھی تھا کہ اب مجھے علوی ہاؤس میں نہیں رہنا۔

"پھر میں دو تین دن کی چھٹی لے لوں گی اور ہم تمہارے سامان کا کچھ کریں گے۔ گھر خالی کرنا ہے۔"

اس رات نرس آنٹی نے مجھے اپنے گاؤں کی اور اپنے بچپن کی بہت ساری باتیں کیں۔ ہم کئی بار روئے اور پھر چپ ہو گئے۔ میں افزا علوی کے بیڈ پر ان کے تکیے سے لپٹ کر سو گیا۔ اور نرس آنٹی کے سونے کے بعد کتنی ہی دیر تک چپکے چپکے روتا رہا اور پاکٹ سے اس کے بال نکال کر دیکھے۔ جو میں نے برش سے نکال کر ایک کاغذ میں لپیٹ کر اپنے پاس رکھ لیے تھے۔

سرجان افزا کی ڈیتھ کا سن کر بہت دیر تک افسوس کا اظہار کرتے رہے اور انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ میرے ہر طرح کے تعلیمی اخراجات فیس کے علاوہ بھی وہی برداشت کریں گے۔ "میں تمہیں پسند کرتا ہوں بیٹا کیونکہ تم ایک ذہین لڑکے ہو اور تمہاری ذہانت کو ضائع نہیں ہونا چاہیے ۔۔۔۔ اور تم بہت بہادر ہو' اب تمہیں اپنے ماں باپ کے بغیر زندہ رہنا ہے تنہا ۔۔۔۔ تم چاہو تو میرے پاس میری ریزیڈنسی میں رہ سکتے ہو۔"

"نہیں ۔۔۔۔ یہ میرے پاس رہے گا اس کی مما نے مجھ سے کہا تھا۔" نرس آنٹی فوراً بول اٹھی۔ اور سر جان مسکرا دیے۔

"او کے نائس لیڈی!"

♥ ♡ ♡ ♥

ہم نرس آنٹی کے کوارٹر میں آ گئے تھے۔ میں نے مما کی چیزیں سنبھال کر ایک اٹیچی میں رکھ لی تھیں۔ مالک مکان نے نرس آنٹی سے کہا تھا کہ وہ بکلی تک مکان کی چابی اپنے پاس رکھ سکتی ہے ۔۔۔۔ کوارٹر میں ایک کمرہ تھا ایک باتھ' کچن اور چھوٹا سا اسٹور برآمدہ اور صحن۔ برآمدے میں چق ڈال کر ایک چار کرسیوں والی گول ڈائننگ ٹیبل ڈال دی گئی تھی۔ کمرے میں دو لوہے کے اسپتال والے بیڈ تھے ۔۔۔۔ نرس آنٹی نے میرا سامان اسٹور میں رکھ دیا تھا اور کمرے سے دو کرسیاں اور ٹیبل اٹھا کر اسٹور میں رکھ کر وہاں چارپائی بچھا کر میرے لیے جگہ بنائی تھی۔

"یہاں اس ٹیبل کو تم اپنی ڈائننگ ٹیبل کے طور پر استعمال کر لینا ۔۔۔۔"

نرس آنٹی نے برآمدے میں بچھی ڈائننگ ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور خود کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دوسری نرس آنٹی کچن میں کھڑی کچھ بنا رہی تھی۔ نرس آنٹی نے مجھے بتایا کہ وہ تمہارے لیے انڈوں کا حلوہ بنا رہی ہے۔ اور آج رات کا سارا کھانا اس نے تیار کیا ہے۔

"ابھی شاید تمہیں تھوڑی سی مشکل ہو' یہ گھر چھوٹا ہے لیکن جب تم تھوڑے اور بڑے ہو جاؤ گے تو

ہم ذرا بڑا گھر کرائے پر لے لیں گے۔ ابھی یہاں جگہ ہے' ابھی میری رات کی ڈیوٹی ہوتی ہے اور کبھی دن کی۔ تم ابھی چھوٹے ہو' اکیلے نہ رہ سکو گے۔ یہاں زیادہ سیف ہے ___ جب میری رات کی ڈیوٹی ہوتی ہو تو نسیم ہوتی ہے گھر پر اور اگر نہ ہو تب بھی یہاں ہاسپٹل کے اندر ڈر نہیں ہے کوئی ___ میں رات میں چکر لگا سکتی ہوں۔" نرس آنٹی نے مجھے بتایا۔

"سونو! تمہیں تو ڈاکٹر پسند ہیں۔ میں تمہارے لیے تو ڈاکٹر ویران بنانے لگی ہوں۔"

نسیم آنٹی نے کچن سے پوچھا' تب ہی دروازے پر دستک ہوئی اور آنے والے شخص کو دیکھ کر نرس آنٹی ہی نہیں میں بھی حیران رہ گیا۔ وہ نجیب اللہ علوی تھا۔

"میں سکندر کو لینے آیا ہوں۔" میرا دل یکدم جیسے اتھاہ گہرائیوں میں گر گیا۔

"لیکن کیوں؟" بے اختیار نرس آنٹی کے ہونٹوں سے نکلا۔

"اس لیے کہ یہ میرے باپ کی اولاد ہے اور میری مجبوری ہے کہ اب جبکہ وہ غاصب عورت زندہ نہیں رہی تو اسے گھر پر رکھوں' مجھے میری ماں نے سمجھایا ہے کہ اسے لے آؤں۔"

پتہ نہیں انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیوں کیا تھا۔ تب میں بالکل نہیں جانتا تھا ___ ہاں میں یہ ضرور جانتا تھا کہ علوی ہاؤس میں میرے لیے محبت نہیں ہے اور میں وہاں خوش نہ رہ سکوں گا۔ لیکن یہ افرا علوی کا حکم تھا کہ مجھے وہاں ہی رہنا ہے۔ نرس آنٹی بھی قول ہار چکی تھی افرا علوی کے سامنے۔ اس نے آخری لمحوں میں جو وعدہ کیا تھا افرا علوی سے اسے نبھانے کے لیے اس نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔ لیکن میں نے دیکھا اس کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی اور آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔

"سونو! تم مجھ سے ملنے آیا کرو گے نا؟"

اور میں نے وعدہ کر لیا۔

انہوں نے آنکھوں میں آئے آنسو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور گھر کی چابیاں نجیب اللہ علوی کے حوالے کر دی تھیں کہ سامان اٹھوا کر چابیاں مالک مکان کو دے دی جائیں ___ مجھے نہیں معلوم کہ وہ سامان کیا ہوا اور نجیب اللہ علوی نے اس کا کیا کیا لیکن وہ اٹیچی کیس جس میں ممّا کے کپڑے تھے اور میرا بیگ نرس آنٹی نے نجیب اللہ کی گاڑی میں رکھوا دیا تھا جسے چوکیدار نے علوی ہاؤس پہنچ کر اس کمرے میں رکھ دیا' جس میں مجھے رہنا تھا ___ یہ کمرہ دراصل گیراج تھا۔ لیکن گیراج کے طور پر استعمال نہیں ہوتا تھا۔ میرے آنے سے پہلے عموماً دن میں چوکیدار اس میں لیٹا رہتا تھا۔ کمرے میں ایک بان کی چارپائی تھی اور ایک تکیہ پڑا تھا۔ بستر کے نام پر صرف ایک دری تھی۔

"تمہیں یہاں رہنا ہے ___ اور بلا ضرورت تم اندر کوٹھی میں نہیں آؤ گے۔"

نجیب اللہ کی آواز میں مجھے ایک سانپ کی سی پھنکار لگی۔

"تمہیں کھانا وغیرہ یہاں ہی مل جایا کرے گا۔"

لان میں کام کرتے مالی نے مجھے ہمدردی سے دیکھا۔ میں حیران تھا کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے ___ میں نے اس کمرے کو دیکھا ___ ایک لمحہ کو میرا جی چاہا کہ میں واپس نرس آنٹی کے پاس چلا جاؤں لیکن پھر مجھے افرا علوی کی یاد آ گئی۔

"تم ایک بہادر بچے ہو سونو! مشکلات سے نہ گھبرانا' ہمت نہ ہارنا۔"

کاش! افرا علوی مجھ پر بہادر ہونے کا لیبل نہ لگاتی تو ___ میں ابھی وہاں ہی کھڑا نجیب اللہ کی تحقیر آمیز نظریں اپنے اندر اترتے محسوس کر رہا تھا کہ رقیہ علوی اور اس کے پیچھے اسما علوی اور مجیب اللہ علوی تینوں ہی باہر آ گئے۔

"تو تم آ گئے؟" رقیہ علوی نے بھنویں اچکائیں۔

"ہم نے تم پر ترس کھا کر یہاں بلا لیا ہے' اسے ہمارا احسان سمجھو۔"

سب ہی مجھے حقارت اور تمسخر سے دیکھ رہے تھے۔ میں خاموش رہا۔

www.allurdu.com

"تو تمہاری ماں مر گئی۔۔۔ ڈائن!"

رقیہ علوی پورچ کی سیڑھیوں سے نیچے اتر کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔۔۔

"ایسوں کا ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔ میرے سہاگ پر ڈاکہ ڈالا تھا۔۔۔ نہ سہاگ رہا نہ خود۔"

رقیہ علوی کی ہنسی میں کچھ عجیب سا تھا۔ میرے اندر روح میں اس کی باتوں سے کہیں کوئی تکلیف، کوئی اذیت ہو رہی تھی۔ لیکن میں ساکت کھڑا تھا۔ پھر وہ سب واپس اندر چلے گئے اور وہ اذیت ہولے ہولے میرے پورے وجود میں پھیل گئی۔ اور اس اذیت سے گھبرا کر میں رونے لگا۔ میں بہت دیر تک روتا رہا۔

♥ ♡ ♡ ♥

پہلی رات جو میں نے اس گیراج میں گزاری وہ بہت مشکل تھی۔۔۔ خوف سے مجھے ایک پل بھی نیند نہ آئی۔۔۔ جتنی سورتیں اور آیات مجھے یاد تھیں، وہ سب میں نے پڑھ ڈالی تھیں۔ اور کہیں لیٹ کر سونے کی کوشش بھی کی لیکن نیند نہیں آئی تھی۔ پتا نہیں رات کب گزری تھی اور صبح کب ہوئی تھی۔ صبح اٹھ کر میں بہت دیر تک اپنے بیڈ پر ہی بیٹھا رہا۔ بیڈ کیا تھا۔ چارپائی جس پر صرف ایک دری، تکیہ اور کھیس پڑا تھا۔ مجھے کیا کرنا ہے میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اسکول بھی جانا تھا۔۔۔ سرجان نے کہا تھا میں بالکل چھٹی نہ کروں۔۔۔ اور باقاعدگی سے اسکول آؤں۔ رات سے میں نے کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔

میرے دل میں یکدم غصہ بھرنے لگا۔۔۔ یہ غصہ سب سے زیادہ اقرا علوی کے لیے تھا۔

آخر اقرا علوی نے یہ کیوں کہا کہ مجھے یہاں رہنا ہے

میں تو کہیں بھی رہ سکتا تھا۔ سرجان کے پاس نرس آنٹی کے پاس۔

غصے کے ساتھ ہی مجھے رونا آ گیا۔ کچھ دیر تک میں روتا رہا۔۔۔ پھر اٹھا اور گیراج سے باہر نکلا۔ سائیڈ پر ایک واش روم تھا۔ چوکیدار اور ڈرائیور وغیرہ کے لیے میں نے وہاں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور پھر اپنے بیگ سے آکر یونیفارم نکالا۔ اپنا بیگ اور اپنی گٹھڑی کو چارپائی کے نیچے کر دیا۔ اور پھر ممّا کی اشیا والا اپنی کھولا اور اس میں سے کچھ روپے نکال لیے۔ ممّا کے پرس میں کچھ سات سو روپے تھے جو نرس آنٹی نے آتے ہوئے مجھے دے دیے تھے۔ میں یونیفارم بدل کر اور بیگ اٹھا کر باہر نکل آیا۔ چوکیدار نے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

"اسکول جا رہے ہو؟"

"ہاں۔"

"تمہارے ماں باپ کہاں ہیں۔ کیا تم صاحب کے گاؤں سے آئے ہو یہاں پڑھنے۔"

"میں حمید اللہ علوی کا بیٹا اور نجیب اللہ علوی کا سوتیلا بھائی ہوں۔"

چوکیدار نے اس دوران گیٹ کھول دیا تھا۔ میں اسے حیران چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

باہر نکل کر میں کچھ دیر کھڑا رہا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کس سمت جانا ہے اسٹاپ کہاں ہے اور کیا وہاں کسی اسٹاپ سے مجھے اپنے اسکول کے لیے ویگن مل جائے گی۔۔۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔ میں کچھ دیر چلتا رہا اور پھر ایک رکشے کو روکا۔۔۔

"مجھے امریکن گرامر اسکول جانا ہے۔ کتنے پیسے لو گے؟"

"بیس روپے۔"

مٹھی میں پکڑے ہوئے پیسوں میں سے بیس روپے نکال کر میں نے رکشے والے کو دیے اور خود گیٹ میں داخل ہو گیا۔ ابھی زیادہ بجے نہیں تھے اسمبلی اسٹارٹ ہونے میں وقت تھا۔ میں نے بیگ کلاس روم میں رکھا اور لان کو کراس کرتا ہوا ہاسٹل کی عمارت کی طرف چلا اور پھر وہاں سے بچوں کی اقامت گاہوں کی طرف مڑ گیا۔ سرجان غالباً تیار تھے اور اپنی ریذیڈنسی کے باہر کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر حیران ہوئے۔

"ہیلو ینگ بوائے! ہاؤ آر یو۔"

"فائن سر!" میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان

بھینچی۔

"اندر آ جاؤ۔" وہ مجھے اپنے ساتھ اندر لے گئے۔

"ناشتہ کیا؟"

غیرارادی طور پر میرا سر نفی میں ہل گیا۔ حالانکہ میں سرجان کو ہرگز یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں بھوکا ہوں۔

"اوکے۔۔۔ خان۔"

انہوں نے اپنے کک کو آواز دی۔ "سکندر بابا کے لیے بریک فاسٹ فوراً تیار کرو۔"

"کہاں سے آ رہے ہو اور مٹھی میں کیا ہے؟"

میں نے مٹھی کھول دی۔ پسینے سے بھیگے ہوئے چند نوٹ تھے۔

"وہ رکشے کا کرایہ دیا تھا باقی پیسے ہیں۔" میں نے ساری تفصیل بتائی۔

"تم بہادر لڑکے ہو، تمہیں ڈرنا نہیں چاہیے۔"

میں خاموش بیٹھا لب کاٹتا رہا۔ سرجان ہولے ہولے بولتے رہے سمجھاتے رہے۔

"اوپر آسمانوں پر رہتا خدا بہت مہربان ہے۔ یسوع مسیح کا خدا اور ہمارا خدا۔ تم گھبراؤ نہیں، ڈرنا نہیں بالکل بھی۔ یہ تمہاری ماما کی خواہش تھی کہ تم اپنے خاندان میں رہو۔۔۔ لیکن کبھی بہت گھبرا جاؤ تو یہاں آ جانا۔ میرے پاس۔"

پھر ناشتہ کرتے ہوئے وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

"دنیا میں بہت سارے لوگ تمہاری طرح رہ جاتے ہیں اکیلے اور زندگی سے جنگ لڑتے ہیں۔ تمہیں بھی سروائیو کرنا ہے۔ زندہ رہنا ہے اور پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بننا ہے۔"

سرجان کی باتوں سے مجھے حوصلہ ہوا تھا اور میرے اندر کا غصہ اور رنج کچھ کم ہو گیا تھا۔ اس روز چھٹی کے وقت سرجان اپنی گاڑی پر مجھے گھر چھوڑنے آئے تھے۔

"اس طرح میں تمہارا گھر دیکھ لوں گا۔ کبھی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔ اور تمہیں راستوں کا بھی سمجھا دوں گا۔" پھر انہوں نے مجھے گھر سے نزدیک ترین اسٹاپ دکھایا جہاں سے اسکول کے لیے مجھے ویگن یا بس مل سکتی تھی اور وہ اسٹاپ بھی بتایا جہاں سے اسکول سے واپسی پر مجھے ویگن ملتی۔ جب انہوں نے علوی ہاؤس کے گیٹ کے پاس اتارا اور ابھی میں نے گیٹ کھلوانے کے لیے بیل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ گیٹ کھلا اور نجیب اللہ علوی باہر نکلا مجھے دیکھتے ہی اس کا رنگ سرخ، آنکھیں انگارہ ہو گئیں اور وہ مجھ پر چنگھاڑا۔

"کہاں مر گئے تھے؟"

اور ساتھ ہی الٹے ہاتھ سے میرے رخسار پر تھپڑ مارا۔

"کس سے اجازت لے کر گھر سے باہر قدم نکالا تھا۔" اس نے پھر ہاتھ اٹھایا اور اس سے پہلے کہ اس کا تھپڑ میرے رخسار پر لگتا پیچھے سے سرجان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

غالباً مجھے مارتے دیکھ کر وہ گاڑی سے اتر آئے تھے۔

انہوں نے ایک جھٹکا دے کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

"کون ہو تم؟" نجیب اللہ غصے سے ان کی طرف مڑا۔

"مجھے آپ کو اپنا بائیو ڈیٹا بتانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن ایک معصوم بچے پر ہاتھ اٹھاتے آپ کو شرم آنا چاہیے۔"

"یہ معصوم بچہ میرا بھائی ہے۔"

"بھائی!" سرجان استہزائیہ انداز میں ہنسے۔ "تب ہی گھر کے گیراج میں رات سے بھوکا پیاسا ہے۔"

نجیب اللہ ذرا سا شرمندہ ہوا۔ "یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے آپ جائیں اپنا راستہ ناپیں۔"

"یہ آپ کا ذاتی معاملہ نہیں ہے۔۔۔ اگر اس کے ساتھ زیادتی ہو گی تو میں مداخلت کروں گا کیونکہ یہ میری صرف اخلاقی ذمہ داری ہی نہیں بلکہ اس بچے کی والدہ نے مجھے اس کا خیال رکھنے کو کہا تھا اور میں اس

www.allurdu.com

کا ٹیچر ہوں۔ مجھے آپ سے صرف یہ کہنا تھا کہ اس بچے کی پڑھائی کسی صورت متاثر نہ ہو۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔

اور اپنی بات مکمل کیے بغیر سرجان واپس اپنی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے۔ اب پتا نہیں یہ سرجان کی شخصیت کا اثر تھا یا وہ ان سے ڈر گیا تھا کہ مزید کچھ کہے بغیر وہ مجھے گھورتا ہوا اندر چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ اور گیراج میں آ کر کپڑے تبدیل کیے اور چارپائی پر بیٹھ گیا میرا ذہن بالکل خالی تھا۔

تین بجنے والے تھے اور بھوک ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ تب ہی رقیہ علوی، مجیب اللہ اور نجیب اللہ آگے پیچھے گیراج میں آئے۔ وہ تینوں چارپائی کے سامنے کھڑے ہو کر اس طرح مجھے دیکھنے لگے جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔

"کون تھا وہ شخص؟" کچھ دیر بعد نجیب اللہ نے پوچھا۔

"میرے ٹیچر تھے۔"

"کیوں لائے تھے انہیں ساتھ؟" اب کے مجیب اللہ نے سوال کیا۔

"مجھے راستوں کا علم نہیں تھا، چھوڑنے آئے تھے اور راستہ بتانے۔"

"وہ تمہاری ڈائن ماں کو کیسے جانتا ہے۔" میری کنپٹیاں جل اٹھیں لیکن جب میں بولا تو میرا لہجہ نارمل تھا۔

"ماما مجھے اسکول چھوڑنے جاتی تھیں اور ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔۔۔۔۔ پیرنٹس میٹنگز پر بھی ملاقات ہوتی تھی اور وہ پاپا کے دوست بھی تھے۔"

یہ جملہ میں نے اپنے پاس سے گھڑا تھا۔ حالانکہ سرجان پاپا سے صرف ایک بار ہی ملے تھے۔

تینوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گے۔" اب کے رقیہ بیگم نے کہا۔

"نہیں میں اسکول جاؤں گا۔"

میں نے خود کو مضبوط کیا۔ مجھے پڑھائی نہیں چھوڑنا تھی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ یہ مجھے سرجان نے کہا تھا۔ اور اگر وہاں رہ کر تمہارے لیے یہ ممکن نہ ہو تو تم میرے پاس چلے آنا۔

میرے لہجے میں شاید میرے عزم کی جھلک تھی یا جانے کیا تھا کہ نجیب اللہ علوی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ماں کو اشارہ کیا اور پھر وہ تینوں یکے بعد دیگرے باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد ملازم ٹرے میں کھانا رکھ کر لے آیا۔ میں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔۔۔۔۔ میں حمید اللہ علوی کا بیٹا تھا۔۔۔۔۔ لیکن گیراج میں بیٹھا ملازموں کی طرح کھانا کھا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہی ملازم پھر آیا۔

"بیگم صاحب نے کہا ہے کہ اپنا سامان اٹھا کر اندر آ جائیں۔"

پھر اس نے سامان اٹھانے میں میری مدد کی۔ لاؤنج میں سے جو سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں ان کا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ اور گلی کی طرف جو سیڑھیاں جاتی تھیں انہیں لاک کر دیا گیا تھا۔ میں ملازم کے پیچھے پیچھے بیگ گھسیٹتا ہوا اوپر پہنچا۔ اسٹور کا دروازہ کھلا تھا۔ ملازم نے مجھے بتایا کہ یہ میرا کمرہ ہے۔۔۔۔۔ آئندہ سے مجھے یہاں رہنا ہے۔ میں نے اسٹور کے شیلف پر دونوں اپنے کیس اور بیگ رکھے۔ یہاں ایک سنگل بیڈ لگا تھا۔ جس پر صاف ستھری چادر بچھی تھی۔ میں کچھ حیران سا اسٹور سے باہر نکل آیا۔

چند سال پہلے تک میں یہاں اقراء علوی اور حمید اللہ علوی کے ساتھ رہتا تھا۔ ساری یادوں نے مجھ پر یلغار کر دی۔ میں جب یہاں سے گیا تھا تو سات آٹھ سال کا تھا اور اب گیارہ سال کا۔ لیکن پھر بھی کئی منظر میری آنکھوں کے سامنے زندہ ہو گئے تھے۔ میں یکدم بہت بے چین اور مضطرب ہو گیا تھا۔ میں وہاں ہی بیڈ روم کے دروازے کے پاس بچھے کارپٹ پر بیٹھ گیا۔ اور اپنا سر گھٹنوں پر رکھ دیا۔ پانی کناروں سے باہر آ گیا تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر تک میں اسی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ روتا رہا۔

پھر اسی ملازم لڑکے نے آ کر مجھے کہا کہ مجھے بیگم صاحب بلا رہی ہیں۔ وہ لڑکا تقریباً میرا ہم عمر تھا اور اس کا نام لطیف تھا۔ میں نے اپنے آنسو پونچھے اور اس کے ساتھ نیچے آ گیا۔ رقیہ علوی غالباً صوفے پر بیٹھی میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ میں اس کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"ہم نے تم پر ترس کھا کر رکھ لیا ہے تمہیں۔" اس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"یہ گھر اور اس گھر کی ہر چیز کے مالک میرے بیٹے ہیں۔ کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔۔۔۔۔ حمید اللہ صاحب نے جو کچھ دینا تھا وہ زندگی میں ہی اس چڑیل کو دے دیا تھا۔"

میرے اندر کہیں ہلچل ہوئی۔ میرا جی چاہا کہ میں اس کا منہ توڑ دوں لیکن میں خاموش کھڑا رہا۔

"تمہیں ہمارا احسان مند ہونا چاہیے کہ ہم نے لاوارث جان کر تمہیں یہاں رکھ لیا ہے۔ تم اسکول سے آ کر لطیف کا ہاتھ بٹاؤ گے اور جو بھی چھوٹا موٹا کام ہوا کرو گے۔ یہ ہمارا ایک اور احسان ہے تم پر کہ ہم نے تمہیں اسکول جانے سے منع نہیں کیا۔ لیکن ہم تمہاری فیس یا اسکول کے اخراجات کے ذمہ دار نہیں ہیں۔"

شاید سرجان کی وجہ سے انہوں نے پڑھائی نہیں چھڑوائی تھی۔

رقیہ علوی نے اس کے علاوہ بھی بہت ساری ہدایات دی تھیں۔ سو میں یہاں رہنے لگا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

یہ میری زندگی کا ایک تکلیف دہ دور تھا۔ جو تقریباً آٹھ سال پر محیط تھا۔ یہ آٹھ سال میں نے جس اذیت میں گزارے انہیں بیان کرنا مشکل ہے۔ اس اذیت نے میرے تمام وجود کو نیلا کر دیا ہے اور اس زہر نے میری ذات و شخصیت میں بہت ساری گرہیں ڈال دی ہیں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے میری رگوں میں سرخ لہو کے بجائے کسی خطرناک زہر کا سیال ہے جو ہر لمحہ میرے وجود کو نیلا کرتا رہتا ہے۔ ان آٹھ سالوں کے ایک ایک لمحے کی روداد بہت طویل اور اذیت ناک ہے لیکن مختصراً یوں سمجھ لیں کہ میں صبح سویرے اٹھ کر کچن میں جا کر سب کے لیے بیڈ ٹی بناتا۔ ان کے بیڈ رومز میں پہنچاتا۔ میرے یہاں آنے کے کچھ عرصہ بعد ہی رقیہ علوی نے لطیف کو نکال دیا تھا اور مجھ سے کہا تھا کہ وہ سارے کام جو پہلے لطیف کرتا تھا وہ میں کروں گا۔ لطیف کے علاوہ اندر کچن میں نسرین بھی کام کرتی تھی۔ وہ البتہ بدستور موجود تھی۔

عموماً نجیب اللہ صبح سویرے مجھے ایک آدھ تھپڑ یا مکا مارتا۔۔۔۔۔ کوئی غلیظ گالی دیتا۔ مجیب اللہ بھی بھائی سے کسی طرح کم نہ تھا۔ سب لوگ دیر سے ناشتہ کرتے تھے اور مجھے جلدی جانا ہوتا تھا اس لیے میں رات کی بچی روٹی گرم کر کے چائے کے ساتھ کھا کر اسکول چلا جاتا اور پھر واپس آ کر برتن دھوتا۔ رقیہ علوی عموماً سب کو کھانا دینے کے بعد مجھے کھانا دیتی۔۔۔۔۔ میں خاموشی سے کھا لیتا تھا۔۔۔۔۔ اور رات تک پیچھے بھی کسی نہ کسی کام میں لگا رہتا۔

عموماً رات کے برتن دھو کر اور کچن صاف کر کے میں سونے کے لیے اوپر جاتا تھا۔۔۔۔۔ پھر صبح تک میں آزاد ہوتا۔۔۔۔۔ پڑھتا۔۔۔۔۔

رقیہ علوی اور اسارہ سمیت سب ہی باری باری میری عزت نفس کو مجروح کر کے خوش ہوتے تھے۔

نجیب اللہ اکثر اپنے پاؤں آگے کر کے حکم دیتا کہ میں اس کے جوتے صاف کروں۔ اور جوتا صاف کرتے کرتے اچانک ہی اس کے بوٹ کی نوک بھی میرے چہرے پر لگتی کبھی سینے پر۔۔۔۔۔ کبھی کبھی وہ مجھ پر تھوک دیتا۔ ہفتے میں دو تین بار دونوں بھائی میری پٹائی کرتے۔ رقیہ علوی کسی معمولی بات پر ڈانٹ ڈپٹ کر کھانا بند کر دیتی۔ میں کبھی کبھی بہت حیران ہوتا کہ آخر یہ سب مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں۔ میری رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے جو ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ اور پھر اگر یہ سب مجھ سے اتنی ہی نفرت کرتے تھے تو پھر مجھے یہاں کیوں لائے تھے۔ لیکن مجھے کبھی اپنے اس سوال کا جواب نہیں ملا۔

www.allurdu.com

ہاں ایک بار سرجان نے کہا تھا۔ کہ شاید تمہارے ان بھائیوں کا یہ خوف رہا ہو کہ تم باہر رہ کر کہیں اپنے حصے کا مطالبہ نہ کرو۔ یا پھر ان کے لیے کوئی پرابلم نہ کھڑی کرو۔"

بہر حال جو کچھ بھی تھا۔ میرا تعلیمی سلسلہ چلتا رہا۔ اگرچہ کئی بار اس میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ ایک بار مجھ پر الزام لگایا گیا کہ میں اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے چوریاں کرتا ہوں۔۔۔ یہ تو سرجان تھے جنہوں نے سارا معاملہ کلیئر کیا۔۔۔ میری حیثیت گھر کے ملازم سے بھی بدتر تھی۔ میری یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ قصور تو حمید اللہ علوی نے کیا تھا۔ ان سب کا مجرم وہ تھا لیکن نفرت میرے حصے میں کیوں آئی۔ ہولے ہولے مجھے حمید اللہ علوی اور افرا علوی اپنے مجرم لگنے لگے رات کو جب میں لیٹتا تو تصور میں سب کو کٹہرے میں کھڑا کرتا اور ہر ایک پر فرد جرم عائد کرتا چلا جاتا تو ان مجرموں کے کٹہرے میں حمید اللہ علوی اور افرا علوی بھی ہوتے اور میں ان کی فرد جرم بھی ان کے ہاتھ میں پکڑا دیتا۔

اگرچہ میری شخصیت عجیب و غریب سی ہو گئی تھی بہت سی کج اور بہت سی نفسیاتی گرہیں اندر ہی اندر پڑ گئی تھیں لیکن حیرت انگیز طور پر میرا تعلیمی سلسلہ چلتا رہا تھا اور میں امریکن گرامر اسکول کا بہترین اسٹوڈنٹ تھا۔ شاید اس کی وجہ سرجان کا التفات اور ان کی توجہ تھی۔۔۔ میں سرجان کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا اگر سرجان نہ ہوتے تو شاید میں بھی خودکشی کر لیتا۔

کئی بار ایسا ہوا کہ جب حبیب اللہ نے میری انسلٹ کی اور حبیب اللہ نے مجھے ٹھوکریں ماریں تو میرا جی چاہا کہ میں زہر کھا لوں بجلی کے ننگے تار ہاتھوں میں پکڑ لوں اور افرا علوی اور حمید اللہ سے جا کر سوال کروں کہ کیوں۔۔۔؟ کیوں کیا انہوں نے ایسا؟ لیکن ہر بار سرجان میرے سامنے آ کھڑے ہوتے۔

"تم کبھی زندگی کے کسی موڑ پر مجھے مایوس نہیں کرو گے۔ میں تمہیں ہمیشہ بلند اور کامیاب دیکھنا چاہتا ہوں۔ بالکل ایسے ہی جیسے اگر کوئی میرا بیٹا ہوتا تو میں اس کے لیے سوچتا ایسے ہی تمہارے لیے سوچتا ہوں۔ میں ہمیشہ تمہیں اپنے ساتھ رکھ کر خوش ہوتا۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ تمہارا کوئی نقصان ہو۔ اور تم اپنے باپ کی جائیداد سے محروم ہو جاؤ۔"

"ایسی جائیداد جس نے مجھے ذلیل و خوار کر دیا تھا" لیکن یہ بات میں سرجان کو نہیں سمجھا سکتا تھا جن کا خیال تھا کہ افرا علوی نے اگر مجھے یہاں رہنے کے لیے کہا تھا تو یقیناً کچھ سوچ کر ہی کہا ہوگا۔

اور افرا علوی نے کیا کیا تھا؟ میرے کیا نقصان کیے تھے اس کو شاید اس کی خبر نہ تھی۔

رقیہ علوی اکثر مجھ پر الزام لگاتی کہ میں چوری کر کے کچن میں سے کھا لیا کرتا ہوں۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا میرے اندر اتنی جرات نہ تھی۔ اگر کبھی رقیہ علوی کھانا دینا بھول جاتی تو میں مانگنے کی بھی جرات نہیں کر سکتا تھا اور ایسا ہفتے میں ایک دو بار ضرور ہوتا تھا کہ رقیہ علوی سب ملازموں کو کھانا بھجوا کر خود آرام کرنے چلی جاتی اور اسے یاد ہی نہیں رہتا کہ مجھے بھی کھانا کھانا ہے۔ اور میں خاموشی سے کچن کی صفائی سے فارغ ہو کر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا رہتا۔ یہ رقیہ علوی کا حکم تھا کہ میں دن میں اپنے کمرے میں نہیں جاؤں گا۔

زندگی یوں ہی گزر رہی تھی۔ ہر دن میرے لیے ایک نئی اذیت لے کر آتا تھا۔۔۔ عزیز رشتہ دار رقیہ علوی کی تعریف کرتے۔ جس نے سوکن کے بیٹے کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ مہنگے اسکول میں پڑھا رہی تھی اور اپنی اولاد کی طرح چاہتی تھی۔۔۔ یہ کوئی میرے دل سے پوچھتا کہ "علوی ہاؤس" میرے لیے ایک اذیت کدہ تھا اور میں نہیں جانتا تھا کہ اس اذیت کدے سے میری رہائی کب ہوگی بھی ہوگی یا نہیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

ان دنوں میں او لیول کا امتحان دے رہا تھا جب گھر میں اچانک ہی حبیب اللہ علوی کی شادی کے ہنگامے شروع ہو گئے۔ میری زندگی کچھ اور مشکل ہو گئی تھی۔ ایک بار پھر مجھے گیراج میں منتقل کر دیا گیا تھا کیونکہ سرونٹ کوارٹر میں چوکیدار اور اس کی فیملی رہتی تھی۔

www.allurdu.com

جاتا۔۔۔

میں سوچتا ہوں اگر میں لیزا سے شادی کر لیتا تو میری زندگی نارمل ہو سکتی تھی وہ مجھے سنبھال لیتی اور شاید گزرتے وقت کے ساتھ میرے اندر موجود نفرت، غصہ اور کھردرا پن ختم ہو جاتا۔۔۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا میں نے لیزا سے شادی نہیں کی۔ کیونکہ میں نے محسوس کیا تھا کہ سرجان اور لیزا دونوں ہی چاہتے ہیں کہ میں اپنا مذہب تبدیل کر لوں۔ گو انہوں نے زبان سے کبھی نہیں کہا تھا۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر بات زبان سے کی جائے۔ کچھ باتوں کے کہنے کے لیے لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ صحیح ہے کہ میں ان کے ساتھ مل کر کرسمس مناتا۔۔۔ کرسمس ٹری سجانے میں پیش پیش ہوتا۔۔۔ ایسٹر مناتا۔۔۔ ویلنٹائن ڈے پر خوبصورت پھول اور کارڈ لیزا کو بھجواتا۔۔۔ لیکن مذہب میرا ذاتی مسئلہ تھا۔۔۔

میں مذہب نہیں چھوڑ سکتا تھا۔۔۔ بھلے میں نے مدتوں سے نماز نہیں پڑھی تھی اور قرآن کو کھول کر نہیں دیکھا تھا۔۔۔ لیکن میں نے نرس آنٹی سے وعدہ کیا تھا کہ میں مذہب نہیں چھوڑوں گا لیکن اگر میں نرس آنٹی سے وعدہ نہ بھی کرتا تو بھی شاید مذہب نہ چھوڑ سکتا۔

ایک بار لیزا بہت دیر تک مجھ سے اس موضوع پر بات کرتی رہی تھی کہ پاکستانی لڑکے جب یہاں کی لڑکیوں سے شادیاں کرتے ہیں تو انہیں مذہب چھوڑنے پر مجبور کرتے ہیں ان کا نام بدل دیتے ہیں حالانکہ وہ خود بھی اپنے مذہب سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوتے۔

لیزا بہت اچھی نیچر کی اور محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ اسے ہمارے ہاں کی یہ روایت بہت پسند تھی کہ یہاں اکثر شادیاں والدین کی پسند پر ہوتی ہیں اور طلاقیں بہت کم ہوتی ہیں۔ میں نہ لیزا کو آزمائش میں ڈالنا چاہتا تھا نہ خود کو اور نہ ہی احسان فراموش کہلوانا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے یکایک واپس آنے کا فیصلہ کر لیا۔

سرجان اور لیزا میرا فیصلہ سن کر شاک کی سی کیفیت میں مجھے دیکھتے رہ گئے۔ کچھ دیر بعد سرجان نے پوچھا۔

"بٹ وائے سکندر؟ تم تو یہاں سیٹ ہو۔ بہت اچھی جاب ہے پھر۔۔۔ وہاں تمہارا کون ہے۔"

"کوئی نہیں۔"

میں نے لیزا کی طرف دیکھا جس نے آج بلیک ٹراؤزر پر ریڈ شرٹ پہن رکھی تھی اور بہت دلکش لگ رہی تھی وہ ابھی تک سکتے کے عالم میں بیٹھی تھی جیسے اسے میری بات کا یقین نہ ہو۔ اس نے اپنی سبز آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں مجھے لگا جیسے میں ان آنکھوں کے سحر میں جکڑا جاؤں گا۔

بمشکل میں نے اپنی نظریں اس کی آنکھوں کے سحر سے آزاد کیں اور سرجان کی طرف دیکھا۔

"سر آپ نے ایک بار کہا تھا کہ ایک وقت آتا ہے جب آدمی اپنی اصل کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اجنبی تہذیب اور ماحول اسے بیزار کر دیتے ہیں۔"

میں نے بارہ سال پہلے سرجان کی کہی ہوئی بات دہرا دی۔ تو سرجان نے پھر اس پر کوئی بحث نہیں کی۔ البتہ میرے آنے سے ایک دن پہلے کہا۔

"سکندر! جب بھی محسوس کرو کہ تنہا ہو گئے ہو۔ جب کبھی اپنے کی ضرورت محسوس ہو تو لوٹ آنا ہم تمہیں منتظر ملیں گے۔"

لیزا اداس تھی۔ اس نے مجھے رکنے کو نہیں کہا تھا لیکن اس کا ہر انداز مجھے روک رہا تھا۔ گھر میں نے اس سے نگاہیں چرائیں اور اسے روتا ہوا چھوڑ کر وطن لوٹ آیا۔ اگرچہ سرجان نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس سے رابطہ رکھوں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ لیزا مجھ سے مایوس ہو کر شادی کر لے۔

♥ ♡ ♡ ♥

پاکستان میں سوائے نرس آنٹی کے میرا کوئی نہیں تھا۔ سو میں ہوٹل میں سامان رکھ کر سیدھا ہاسپٹل گیا تھا اور ہاسپٹل سے نکل کر بلا ارادہ ہی میرے قدم "علوی ہاؤس" کی طرف چل پڑے تھے۔ پتا نہیں کیوں حالانکہ میں جانا نہیں چاہتا تھا وہاں۔

میں نے کبھی ایک لمحے کو بھی نہیں سوچا تھا کہ میں

کبھی دوبارہ ان لوگوں کو دیکھوں گا یا ان سے ملوں گا حالانکہ لیزا مجھ سے اصرار کرتی رہتی تھی کہ میں پاکستان جا کر اپنے حق کا مطالبہ کروں۔۔۔ آخر میں حمید اللہ کا بیٹا ہوں اور جتنا حق نجیب، عجیب اور اسماء کا ہے اتنا ہی میرا بھی ہے۔۔۔ لیکن میں ہمیشہ کہتا تھا کہ مجھے سرجان کی محبت اور تمہاری دوستی مل گئی ہے اور اس سے قیمتی اور کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔ لیکن جب میں علوی ہاؤس کے سامنے ٹیکسی سے اترا تو خود ایک لمحہ کو حیران رہ گیا۔۔۔ پھر میں نے سیاہ گیٹ کے سامنے رک کر کال بیل پر ہاتھ رکھ دیا حالانکہ ایک لمحہ پہلے میرے دل میں خیال آیا تھا کہ واپس پلٹ جاؤں لیکن جب میں نے کال بیل پر ہاتھ رکھا تو میرے اندر ایک عجیب کمینی سی خوشی رقص کرنے لگی۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران ہو جائیں گے سب۔۔۔ شاید ڈر جائیں۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے سراپے کے متعلق سوچا۔۔۔ میں اب گیارہ سال کا کمزور بچہ نہ تھا میں سالہ مرد تھا۔ مضبوط اعصاب کا مالک جسم جو جوڈو کراٹے اور یوگا کی مشقوں نے مجھے دشمن سے نمٹنا سکھا دیا تھا۔۔۔ میرے دل میں شدت سے خواہش پیدا ہوئی کہ آج نجیب اللہ مجھ پر ہاتھ اٹھائے اور میں اس کا ہاتھ اس کے جسم سے علیحدہ کر کے پھینک دوں۔

میں اتنے سالوں سے جو بھولا ہوا تھا۔ وہ سب وہاں گیٹ پر کھڑے کھڑے میں نے یاد کر لیا۔ میرے اندر ایک تیز آگ بھڑک اٹھی۔۔۔ تب ہی چوکیدار نے گیٹ کی کھڑکی سے جھانکا۔

"کون؟" یہ چوکیدار نیا تھا۔۔۔

"سکندر! اندر جا کر بتاؤ کہ سکندر علوی آیا ہے۔ حمید اللہ علوی کا بیٹا۔"

میں نے مزید وضاحت کی۔

میری وضاحت پر اس نے ایک لمحہ کو ٹھٹک کر مجھے دیکھا اور پھر کندھے اچکاتا ہوا اندرونی گیٹ تک گیا اور وہاں انٹر کام پر اندر بات کی۔ اور پھر مڑ کر گیٹ کھول دیا۔

"آئیے۔"

سامنے صوفے میں دھنسی وہ رقیہ علوی تھیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ بارہ سالوں میں وہ اتنی بدل جائیں گی۔ وہ بے حد کمزور اور بوڑھی لگ رہی تھیں۔ اور جب انہوں نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور میری طرف اشارہ کیا تو ان کا ہاتھ لرز رہا تھا۔

"تم سکندر ہو۔۔۔ افزا کے بیٹے۔"

"صرف افزا کا ہی نہیں حمید اللہ کا بھی بیٹا۔"

میں جب بولا تو مجھے خود یوں محسوس ہوا جیسے میرے لہجے میں سانپ کی سی پھنکار ہو۔

"اپنا حصہ لینے آئے ہو؟" انہوں نے ہاتھ نیچے کر لیا۔ "کل وکیل کو لے آنا اور اپنا حصہ لے لینا۔"

میں ایک لمحہ کو حیران رہ گیا۔

"بیٹھ جاؤ۔"

انہوں نے پھر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں نے ان کے ہاتھوں میں واضح لرزش محسوس کی۔ شاید انہیں کسی طرح کی بیماری تھی۔

"تمہارا وکیل کاغذات تیار کرے گا پھر عدالت دیکھیں جہاں تو جو کچھ کرنا ہو کر لینا۔"

ان کی آواز میں بہت شکستگی سی تھی۔ میں حیران سا بیٹھا تھا۔

"میں عدالت نہیں جا سکوں گی اور۔۔۔"

انہوں نے پھر کہا تو بے اختیار میرے ہونٹوں سے پھسل پڑا۔

"نجیب اللہ اور عجیب اللہ کہاں ہیں؟"

"نجیب اللہ اس دنیا میں نہیں ہے اب اور۔۔۔"

ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ "تمہارے جانے کے کچھ ہی دنوں بعد اسماء نے اپنی مرضی سے اپنی ایک سہیلی کے بھائی سے کورٹ میرج کر لی۔ نجیب تو ہمیشہ سے ہی غصے کا تیز ہے۔ پتا نہیں کیوں۔۔۔ جب حمید اللہ نے شادی کی تھی تب بھی وہ ایسے ہی غصے میں بھر گیا تھا اور بار بار ریوالور نکال لیتا اور کہتا میں ابھی جا کر افزا کو اور ڈیڈی کو شوٹ کر دوں گا۔ وہ تو میں ہی اسے سنبھالے رکھتی۔۔۔ وہ غصے میں چیزیں توڑتا پھوڑتا رہا۔۔۔"

www.allurdu.com

نسرین چوکیدار کی بیوی تھی جو کچن کا کام کرتی تھی۔

جب میں افزا علوی کا اٹیچی کیس سیڑھیوں سے نیچے لا رہا تھا تو وہ کھل گیا اور اس کے کپڑے بکھر گئے۔ اس کا پرس، اس کی ساڑھیاں۔

اس کے وہ قیمتی زیورات جو اس نے حمید اللہ کی وفات کے بعد پہننا چھوڑ دیے تھے۔

رقیہ علوی لی ونگ لاؤنج کے بیچوں بیچ آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے کھڑی تھی۔ میں جھک کر کپڑے اکٹھے کرنے لگا تو اس نے میری پیٹھ پر لات ماری۔

"کمبخت چور ڈاکو۔۔۔ کہاں سے چرا کر لائے ہو یہ۔"

میرے لیے یہ سب روٹین کی بات تھی، سو میں نے سیدھا ہوتے ہوئے نارمل لہجے میں کہا۔

"یہ سب ممانی کی چیزیں ہیں۔" رقیہ علوی نے ہونٹ سکیڑے۔

"یہ سب گند کس لیے سنبھال کر رکھا ہوا ہے؟"

"نسرین!" اس نے نسرین کو بلایا۔ "اٹھاؤ یہ سب کپڑے اور سامان تمہارے کام آئے گا۔ اچھے کام والے کپڑے بیٹی کی شادی کے لیے رکھ چھوڑنا۔"

میں ساکت کھڑا رہ گیا میرے اندر اتنی جرأت نہ تھی کہ میں منع کرتا یا ممانی کی کوئی چیز اٹھا کر نشانی کے طور پر رکھ لیتا۔

"اور یہ ذرا اپنا بیگ اور اٹیچی بھی کھولو۔" انہوں نے حکم دیا۔

بیگ میں کتابیں تھیں اور اٹیچی میں میرے کپڑے تھے۔ ان میں وہ نئے کپڑے بھی تھے جو نرس آنٹی مجھے ہر عید پر ہوا کر لا کرتی تھی لیکن میں ان دنوں انہیں نہیں پہنتا تھا البتہ رات کو اپنے اسٹور والے کمرے میں جا کر پہن لیتا۔

"یہ کیا ہے؟" رقیہ علوی ایک ایک چیز کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ افزا علوی کے سامان میں ایک چھوٹا سا جیولری بکس تھا۔۔۔ بالکل پھولی سی ڈبیا جیسا۔ اسے میں نے اپنے بیگ میں رکھا ہوا تھا اور اس میں افزا علوی کے بال رکھ چھوڑے تھے وہ بال جو اس صبح جب اس کی واشنگ ہوئی تھی میں نے برش سے نکال کر اپنی پاکٹ میں رکھ لیے تھے۔

رقیہ علوی نے ڈبیا کھولی اور پھر یوں ڈر کر پیچھے پھینک دی جیسے کوئی سانپ دیکھ لیا ہو۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا ہے۔ تم جادو کرتے رہتے ہو یہ سب یہ۔ ضرور ان بالوں پر بھی تم نے کوئی جادو کر کے رکھا ہو گا۔ میں بھی کہوں یہ اسمارا کی منگنی کیوں ٹوٹی ہے۔ حبیب اللہ کو یہ ٹھیک کیوں نہیں ہونے دیتا اسپتال کا اور حبیب اللہ کی گاڑی کا کل ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا۔۔۔ یہ ضرور تمہاری کارستانی ہے۔ تم چاہتے ہو کہ سب مر جائیں اور تم قابض ہو جاؤ ہر شے پر لیکن ایسا ہو گا بھی نہیں۔"

"یہ میری ماما کے بال ہیں۔۔۔ میں نے برش سے نکالے تھے۔" میں نے تفصیل بتائی۔

اور رقیہ علوی کے حکم پر ڈبیا اٹھاتے ہوئے نسرین کا ہاتھ کانپ گیا۔

"پھینک دو اسے آگ میں۔ جانے کیا بک رہا ہے۔"

میں نے ہاتھ آگے کیے جیسے میں نسرین کو منع کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے وہ ڈبیا لینا چاہتا ہوں۔ لیکن میرا ہاتھ فضا میں ہی معلق رہ گیا اور زبان جیسے کسی نے سی دی۔

آج میں گیراج میں تھا لیکن مجھے خوف نہیں آ رہا تھا۔ البتہ میرا اندر جیسے خالی خالی ہو گیا تھا۔ جیسے مجھ سے کوئی بہت قیمتی متاع چھن گئی ہو۔ جیسے میں کنگال ہو گیا تھا۔ وہ رات میں نے آنکھوں میں جاگ کر گزاری تھی۔ حالانکہ صبح میرا پیپر تھا لیکن میں نے کتابوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ میری حالت یوں ہو رہی تھی جیسے کوئی سب کچھ لٹا کر خالی ہاتھ بیٹھا ہو۔

میرے پیپرز اور حبیب اللہ کی شادی کے ہنگامے ایک ساتھ ہی ختم ہوئے تھے۔ آخری پیپر والے دن میں باوجود خواہش کے سرجان سے نہیں مل سکا تھا۔ حالانکہ سرجان نے مجھ سے کہا تھا کہ میں پیپرز سے

فارغ ہو کر ان سے مل لوں۔

اس روز حبیب اللہ کی بارات تھی اور رقیہ علوی نے مجھے بار بار تاکید کی تھی کہ میں اسکول سے سیدھا گھر آؤں اور گھر کا دھیان رکھوں۔ دلہن کا جہیز آیا تھا۔ خانہ خالی نہیں کوئی ڈاکو نہ آ جائے۔ اور عدم موجودگی میں سب کچھ لوٹ کر لے جائیں۔

میں نے سوچا تھا کہ میں ویسے ہی فارغ ہو کر ان سے مل لوں گا۔ فرسٹ فلور بیٹھی اور والے بیڈ روم کو حبیب اللہ کے لیے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ یہ حمید اللہ علوی اور افزا علوی کا بیڈ روم تھا۔

شادی کے اگلے دن کی بات تھی میں رقیہ علوی کے ہی حکم پر یہ دیکھنے کے لیے اوپر گیا تھا کہ نسرین اوپر کچن میں تو نہیں ہے۔ نسرین کچن میں نہیں تھی۔ فرسٹ فلور پر مکمل خاموشی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب میں کچن میں دھلے برتن سنبھال رہا تھا تو میں نے حبیب اللہ علوی کو لاؤنج میں کھڑے رقیہ علوی سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ گویا حبیب اللہ اور اس کی دلہن جا چکے تھے۔ صبح میں نے اسمارا کو بھی کہتے سنا تھا کہ وہ واپس ہنی مون منانے کے بعد آئیں گے۔ حبیب اللہ والے بیڈ روم کا دروازہ نیم وا تھا۔ جب میں اوپر گیا تھا تو میرا ارادہ تھا کہ میں اس بیڈ روم کو قریب سے دیکھوں۔ دیواروں کو چھو کر دیکھوں کہ افزا کا لمس محسوس کروں۔ لیکن اوپر کے سب کمرے لاک رہتے تھے اور جانے کب شاید جب میں اسکول میں ہوتا تھا تو نسرین صفائی کرتی تھی۔

اب دروازہ نیم وا تھا اور میں کھنچا ہوا سا دروازے تک آ گیا تھا۔ پھر میں نے اسی سوئی سوئی کیفیت میں دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ حبیب اللہ اور اس کی دلہن جا چکے ہیں۔ لیکن دلہن مجھے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔ وہ ابھی تک نائٹ ڈریس میں تھی۔ وہ بیزار سی نظر آ رہی تھی اور میں اٹھتے قدموں پیچھے ہٹا تب ہی حبیب اللہ نے مجھے گردن سے پکڑا۔ جانے کب وہ اوپر آیا تھا مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ ہیڈ کاریڈور پر مجھے اس کے قدموں کی آہٹ بھی سنائی نہیں دی تھی۔

"گیٹ آؤٹ!" اس کی دلہن چلائی۔ "آپ تیزی نہیں کہ دروازہ ناک کر کے آتے ہیں۔"

اور پھر حبیب اللہ نے مجھے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔

"کس کام سے آئے تھے؟" میرے پاس اس سوال کا جواب نہ تھا۔ شور سن کر رقیہ علوی بھی اوپر آ گئی اور ثابت یہ ہوا کہ میں کسی بری نیت سے بیڈ روم کی طرف گیا تھا۔ دلہن کا زیورات کا بیگ بیڈ پر پڑا تھا شاید اسے چرانے یا پھر کسی اور غلط نیت سے۔

میرے سامنے وہ بیڈ روم تھا۔ جہاں میں نے حمید اللہ اور افزا علوی کو ہنستے مسکراتے دیکھا تھا۔ جہاں جب میرا جی چاہتا تھا میں چلا آتا تھا اور جہاں بیڈ پر بیٹھ کر میں افزا علوی سے کارڈ اور کیرم کھیلتا تھا۔ مختلف منظر میری آنکھوں کے سامنے آ اور جا رہے تھے۔ نئی دلہن حیران سی کھڑی مجھے پٹتے دیکھ رہی تھی۔

شاید اسے اتنے شدید رد عمل کی توقع نہ تھی۔ لیکن اسے کیا خبر تھی کہ یہ رد عمل برسوں پر محیط ہے۔۔۔ یہ صرف آج کی غلطی کا رد عمل نہیں ہے۔ یہ رد عمل تو اس غلطی کا ہے جو میرے باپ نے کی تھی اور جس کی مرتکب میری ماں ہوئی تھی۔ شاید حبیب اللہ کو بہت رنج ہوا ہو حمید اللہ کی شادی کی خبر سن کر شاید اسے بہت غصہ آیا ہو۔ اسمارا چھپ چھپ کر روئی ہو۔ رقیہ علوی نے سہاگ کی شمیم مشکل سے برداشت کی ہو شاید وہ سب اپنے رد عمل میں سچے ہی ہوں۔

لیکن میں۔۔۔ میرا کیا قصور تھا اور اب جو رد عمل میرے اندر سے باہر آتا تھا اس کی زد میں کون آئے گا۔

پھر شاید دلہن کے کہنے پر حبیب اللہ نے مجھے چھوڑ دیا اور خون آلود ہونٹوں سے مجھے گھورتا ہوا اپنی دلہن کو لے کر اندر چلا گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ سارے منظر ایک ایک کر کے غائب ہو گئے اور گھٹا ٹوپ اندھیرا میرے وجود کے در و دیوار پر چھا گیا اور مجھے میرا وجود نوچ رہا تھا۔

www.allurdu.com

میرے چہرے پر جگہ جگہ نیل پڑے تھے میری ٹانگیں کئی جگہ سے چھل گئی تھیں جہاں جہاں اس کے بوٹ لگے تھے وہاں وہاں نیل ابھر آئے تھے۔ میں بمشکل اٹھا تھا۔ میرا سر بھی چکرا رہا تھا اور سر میں بھی جگہ جگہ گومڑ تھے۔ میں سیڑھیوں سے نیچے اترا اور کھلے گیٹ سے باہر نکلتا چلا گیا۔ میں بغیر کوئی راستہ متعین کیے گھر سے نکلا تھا اور اب چلتے چلتے سرجان کی اقامت گاہ پر پہنچ گیا تھا۔

"او ینگ بوائے!" سرجان نے مجھے تھام لیا۔ اور سہارا دے کر بٹھایا "میں تمہارا انتظار کر رہا تھا اور تم کہاں چلے گئے تھے اور یہ سب کیا ہے؟"

"یہ سب؟" میں نے آہستگی سے کہا اور میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں ۔۔۔ میں اٹھارہ انیس سال کا لڑکا ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بچوں کی طرح رو رہا تھا اور سرجان غصے میں اپنے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ وہ میرے بتائے بنا ہی شاید جان گئے تھے کہ میری یہ حالت کس نے کی ہے۔ انہوں نے کچھ دیر مجھے رونے دیا اور پھر آہستگی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھے۔

"یہ آج تمہارے آخری آنسو ہیں۔ اگر تم اور رونا چاہو تو رو سکتے ہو لیکن آج کے بعد میں تمہیں رونے نہیں دوں گا۔"

پھر وہ کچھ دیر کے لیے مجھے کمرے میں اکیلا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد میں خود ہی آنسو پونچھ کر اور چہرہ صاف کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ غالباً" پچھلے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے۔

"Now do youfeel well" (کیا تم اب بہتر محسوس کرتے ہو؟)

میں نے سر ہلا دیا اور ان کے کچھ پوچھنے سے پیشتر ہی ساری بات کہہ دی۔

"میں نے تمہیں اس لیے بلایا تھا کہ تم سے تمہارا آگے کا پروگرام پوچھوں۔ کیونکہ میں اپنے وطن واپس جا رہا ہوں۔ میں چاہ رہا تھا کہ تمہارے اکاؤنٹ میں کچھ رقم جمع کرا جاؤں تاکہ تمہارے کام آسکے۔ لیکن اب میں نے فیصلہ بدل دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنے ساتھ ہالینڈ لے جاؤں۔ وہاں رہ کر تم اپنی ایجوکیشن مکمل کرو۔ وہاں تم ایجوکیشن کے ساتھ ساتھ جاب بھی کر سکو گے۔ میرے پلان میں یہ تھا کہ تمہیں وہاں بلواؤں گا لیکن میں چاہ رہا تھا کہ تم یہاں سے اپنی گریجویشن مکمل کر لو لیکن اب ۔۔۔ میں تمہیں ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ کیا تم راضی ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میرا کوئی بیٹا نہیں ہے اور تم میرے بیٹے کی طرح ہو سن۔ میری ایک بیٹی ہے لیزا۔ تمہاری ہی عمر کی ہوگی اب۔ میں نے پندرہ سالوں سے اسے نہیں دیکھا۔ تقریباً" تین سال کی تھی جب اس کی ماما مجھ سے علیحدہ ہو گئی تھی اور عدالت کے فیصلے کے مطابق اسے اس کی ماما کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اگر میں وہاں رہتا تو شاید اس سے ملتا رہتا لیکن میں اس کے فوراً" بعد ہی پاکستان آگیا تھا۔ یہ جاب مجھے پسند آئی تھی۔ میرے دوست نے مجھے اس کے متعلق لکھا تھا وہ یہاں امریکن سفارت خانے میں ملازم تھا۔ جینسی کی علیحدگی نے مجھے اندر سے توڑ دیا تھا۔ میں نے جینسی سے محبت کی تھی۔ میں علیحدگی نہیں چاہتا تھا لیکن ہمارے درمیان چارلس آگیا تھا اس کا باس ۔۔۔ سو میں نے اپلائی کیا اور چلا آیا۔ ۔۔۔ لیزا کو میں یہاں سے خط لکھ بھجواتا رہتا ہوں ۔۔۔ کبھی کبھار فون بھی کر دیتا ہوں وہ پڑھ رہی ہے اور اس کا خیال آرکیٹیکٹ بننے کا ہے۔"

سرجان پہلی بار مجھے اپنے اور اپنی ذات کے حوالے سے کچھ بتا رہے تھے۔

"اتنے طویل عرصہ سے ایک غیر ملک غیر تہذیب میں رہتے رہتے میں کچھ بیزاری سی محسوس کرنے لگا ہوں۔ پھر لیزا سے ملنے کی خواہش بھی بہت شدید ہے۔ میں نے کئی بار اسے کہا کہ وہ اپنی چھٹیوں میں یہاں آئے لیکن وہ بھی فارغ نہیں ہوتی یا تو اپنا سمسٹر بھگتاتی رہتی ہے۔ یا کہیں جاب کرتی ہے۔

آج کل بھی وہ ایک پٹرول پمپ پر کام کر رہی ہے۔ اور کچھ دن پہلے ہی وہ اپنے سمسٹر سے فارغ ہوئی ہے اس کا سمسٹر اسٹارٹ ہونے تک وہ یہاں ہی جاب کرے گی۔ سو میں نے ریزائن دے دیا ہے۔ سر پیٹر نے بہت کہا ہے کہ میں لیزا سے مل کر اور کچھ عرصہ اپنے وطن میں رہ کر واپس آجاؤں ۔۔۔ لیکن میں واپس آنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ کوئی کب تک کسی دوسری تہذیب اور ملک میں رہ سکتا ہے۔ ایک دن تو اپنی اصل کی طرف لوٹنا ہی ہوتا ہے۔ تمہارا ملک بہت خوبصورت ہے بیٹا لیکن میرا ملک بھی کم خوبصورت نہیں۔"

اس روز سرجان نے مجھے گرم پانی سے ٹکور کی اور دوا دے کر سونے کی تاکید کی۔

"اب تمہیں علوی ہاؤس واپس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے تمہاری ماما سے کیا ہوا عہد نبھانے کی بہت کوشش کی ہے اور اپنی حد تک اسے نباہ دیا ہے۔ مردہ لوگوں کی خواہشات زندہ لوگوں کی زندگیوں سے زیادہ اہم نہیں ہوتیں۔ اس لیے کچھ مت سوچو اور چیئر اپ ہو۔"

پھر مجھے معلوم نہیں کہ سرجان نے کیسے اور کس طرح مجھے ساتھ لے جانے کا بندوبست کیا۔ مگر سرجان نے سب کر لیا تھا اس میں دو ماہ سے زیادہ کا عرصہ لگ گیا تھا۔ اس دو ماہ کے دوران میں سرجان کے ساتھ ہی رہا تھا اور سرجان نے میرے لیے بہت ساری شاپنگ کی تھی۔ اگرچہ میں ایک دن موقع دیکھ کر اپنا سامان گیراج سے اٹھا لایا تھا۔ میں اس وقت گیا تھا جب کسی کے گھر پر ہونے کا امکان نہ تھا۔ یوں بھی میرا سامان گیراج میں تھا۔ سورتیہ علوی کو خبر بھی نہ ہو سکی کہ میں کب آیا تھا۔

جب تمام انتظام مکمل ہو گئے تو میں نرس آنٹی سے ملنے گیا ۔۔۔ وہ میری کچھ نہیں لگتی تھی لیکن پھر بھی میرے لیے روئی تھی۔ میرا خیال رہتا تھا ۔۔۔ میں نہیں اس سے محبت کرتا تھا۔ نہیں لیکن وہ مجھ سے اپنے بچوں جیسی ہی محبت کرتی تھی۔ اس نے مجھے قرآن کا تحفہ دیا تھا اور اس طرح نصیحتیں کی تھیں جیسے ایک ماں کرتی ہے۔

"تم ایک کرسچن کے ساتھ جا رہے ہو' اپنا مذہب نہ چھوڑنا ۔۔۔ مذہب ہی سب کچھ ہوتا ہے اور تم ایک ایسے دین کے ماننے والے ہو جو سب سے سچا دین ہے۔"

وہ بہت دیر تک مجھے سمجھاتی رہی۔ اس نے مجھے افرا علوی اور حمید اللہ علوی کی قسم دی کہ میں شراب نہیں پیوں گا۔ میں نے اس کی قسم کھائی۔ افرا علوی اور حمید اللہ علوی مجھے اس ظالم دنیا کے حوالے کر کے چلے گئے تھے میں ان سے خفا تھا اس لیے میں نے اس کی قسم کھائی اور وعدہ کیا کہ چاہے کچھ بھی کروں لیکن شراب کبھی نہیں پیوں گا اور میں نے اپنا وعدہ نبھایا بھی ۔۔۔ بہت سے مواقع ایسے آئے تھے جب میرا دل چاہا تھا کہ خود کو شراب میں گم کر دوں لیکن نرس آنٹی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا ۔۔۔

نرس آنٹی خیال میں روتی اور دل میں اترتی اور میں اپنے ارادے سے باز آجاتا۔

نرس آنٹی نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں وہاں جا کر نماز باقاعدگی سے پڑھوں اور جب بھی وقت ملے قرآن پڑھا کروں۔

سچ تو یہ ہے کہ جب سے افرا علوی کا انتقال ہوا تھا نہ تو میں نے قرآن پڑھا تھا اور نہ ہی نماز۔ حالانکہ جب افرا علوی زندہ تھیں تو وہ صبح سویرے نماز پڑھنے کے بعد مجھے بھی اٹھا دیتی تھیں اور ناشتے سے پہلے مجھ سے قرآن کا ایک رکوع ہر روز ضرور سنتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ نہیں تو میں بھول جاؤں گا کیونکہ ابھی میں نے صرف دوبار ہی قرآن ختم کیا تھا۔ جب میں نے قرآن ختم کر لیا تو پھر گھر میں ہی پڑھنے لگا تھا۔ کیونکہ ایک تو مجھے بھی دیر ہو جاتی تھی اور مجھے بہت سارا ہوم ورک کرنا ہوتا تھا دوسرے محلے کی کچھ لڑکیاں افرا علوی سے قرآن پڑھنے آجاتی تھیں تو میں بھی ساتھ ہی پڑھ لیتا ۔۔۔

اس رات میں نے کھانا نرس آنٹی کے ساتھ ہی کھایا تھا۔ نرس آنٹی مجھے خدا حافظ کہتے ہوئے بے

www.allurdu.com

تماشا رو رہی تھی۔ یہ میری نرس آنٹی سے آخری ملاقات تھی۔ پھر زندگی میں دوبارہ میں کبھی نرس آنٹی سے نہیں مل سکا۔ حالانکہ جب میں پاکستان آیا تو نرس آنٹی سے ملنے اسی ہاسپٹل میں گیا تھا لیکن پتا چلا کہ وہ اپنی جاب چھوڑ کر گاؤں چلی گئی تھیں کیونکہ اس کی ماں معذور ہو کر بستر پر پڑ گئی تھی اور ماں کو اس کی ضرورت تھی۔ اس کا گاؤں کون سا تھا یہ مجھے معلوم نہ تھا نہ ہی وہاں کسی سے پتا چل سکا۔

♥ ♡ ♡ ♥

میں سرجان کے ساتھ ہالینڈ آگیا اور اپنی زندگی کے بارہ سال میں نے یوں گزار دیے کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور پھر پیچھے میرا تھا ہی کون جو مڑ کر دیکھتا۔

میں نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی تھی اور ایک بڑی کنسٹرکشن کمپنی میں بہترین تنخواہ پر ملازم تھا۔

سرجان مجھ سے محبت کرتے تھے۔

لیزا میری دوست تھی۔

جب پہلی بار میں نے لیزا کو دیکھا تو کتنی ہی دیر تک دیکھتا رہا..... وہ بہت خوبصورت تھی۔ اس کی آنکھیں سبز تھیں اور بال سنہری تھے۔ وہ اپنی سائیکل پر سرجان سے ملنے آئی تھی۔ سرجان بھی ایک طویل عرصہ بعد اپنی بچی سے ملے تھے وہ بہت جذباتی سین تھا۔ میں منظر سے ہٹ گیا۔ کچھ دیر بعد سرجان کو میرا خیال آیا اور انہوں نے لیزا سے میرا تعارف کروایا۔

"گلیڈ ٹو میٹ یو۔" اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

اگلے چند برسوں میں لیزا کے ساتھ میری دوستی بہت گہری ہو گئی تھی میرے مزاج میں ایگریشن، کھردرا پن، وحشت اور غصہ بے حد بڑھ گیا تھا۔ شاید یہ ردعمل تھا۔ کبھی کبھی میری اس وحشت اور کھردرے پن کا شکار لیزا بھی ہو جاتی تھی۔ لیکن اس نے کبھی مائنڈ نہیں کیا تھا۔ وہ میری نفسیات سمجھتی تھی وہ ہر ایک ویک اینڈ پر اپنی سائیکل پر ہمارے اپارٹمنٹ میں آجاتی۔ کچن میں جا کر کافی بناتی۔ سینڈوچز بناتی کیک بیک کرتی اور بقول سرجان کے اس روز ہماری عید ہو جاتی تھی۔ وہ چکن روسٹ کرتی اور ہم سب مل کر لنچ کرتے اور پھر اپنی اپنی سائیکلیں اٹھا کر گھومنے نکل جاتے۔ یہاں ہالینڈ میں سائیکلوں کا استعمال بہت زیادہ تھا۔ اگرچہ سرجان کے پاس گاڑی بھی تھی لیکن وہ بھی اکثر سائیکل پر دفتر جاتے تھے۔ ہالینڈ آتے ہی انہوں نے ایک کمپنی میں جاب کر لی تھی۔ وہ اکثر سرجان سے شادی کرنے کو کہتی اور سرجان مسکرا دیتے۔

ایک بار وہ مجھے اپنی ممی سے بھی ملوانے لے گئی..... اس کی ممی ایک شاپنگ پلازہ میں جاب کرتی تھی..... وہ واقعی ایک خوبصورت عورت تھی لیزا سے بھی زیادہ..... لیزا اپنی ماں کے ساتھ نہیں رہتی تھی بلکہ اپنی ایک فرینڈ کے ساتھ رہتی تھی دونوں نے مل کر ایک اپارٹمنٹ لے رکھا تھا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں پاکستان آؤں گا۔ میں اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔ لیکن پھر مجھے احساس ہوا جیسے سرجان چاہتے ہیں کہ میں لیزا سے شادی کر لوں..... شاید خود لیزا بھی یہی چاہتی تھی۔ ہم دونوں بہت اچھے دوست تھے۔

ان بارہ سالوں میں کئی بار ایسے مقام آئے جب ہم نے ایک دوسرے کے لیے قربانیاں دیں۔ ہماری ایک دوسرے کے لیے دی گئی قربانیاں سرجان کے سامنے تھیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت مخلص تھے۔ میں اگر لیزا سے کہتا کہ وہ میرے لیے جان دے دے تو وہ دے دیتی۔ اور اگر لیزا مجھے کہتی تو میں اپنا سر خود کاٹ کر اسے پیش کر دیتا..... سرجان ہم دونوں کی دوستی پر خوش تھے وہ شفقت سے مسکراتے ویک اینڈ پر ہمیں گھومنے بھجواتے لمبی چھٹیوں میں کہیں نہ کہیں کا ٹکٹ ہم دونوں کا مل جاتا۔

لیزا میں ایک عادت یہ تھی کہ وہ میرا سارا غصہ اور ایگریشن برداشت کر لیتی تھی بلکہ ان لمحوں میں مجھے سہارا دیتی۔ میرے قریب ہونے کی کوشش کرتی مجھ سے اتنی محبت کرتی کہ میں اپنے غصہ پر شرمندہ ہو

www.allurdu.com

جاتا۔۔۔

میں سوچتا ہوں اگر میں لیزا سے شادی کر لیتا تو میری زندگی نارمل ہو سکتی تھی وہ مجھے سنبھال لیتی اور شاید گزرتے وقت کے ساتھ میرے اندر موجود نفرت' غصہ اور کھردرا پن ختم ہو جاتا۔۔۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا میں نے لیزا سے شادی نہیں کی۔ کیونکہ میں نے محسوس کیا تھا کہ سرجان اور لیزا دونوں ہی چاہتے ہیں کہ میں اپنا مذہب تبدیل کر لوں۔ گو انہوں نے زبان سے کبھی نہیں کہا تھا۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر بات زبان سے کی جائے۔ کچھ باتوں کے کہنے کے لیے لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ صحیح ہے کہ میں ان کے ساتھ مل کر کرسمس مناتا۔۔۔ کرسمس ٹری سجانے میں پیش پیش ہوتا۔۔۔ ایسٹر مناتا۔۔۔ ویلنٹائن ڈے پر خوبصورت پھول اور کارڈ لیزا کو بھجواتا۔۔۔ لیکن مذہب میرا ذاتی مسئلہ تھا۔۔۔

میں مذہب نہیں چھوڑ سکتا تھا۔۔۔ بھلے میں نے مدتوں سے نماز نہیں پڑھی تھی اور قرآن کو کھول کر نہیں دیکھا تھا۔۔۔ لیکن میں نے نرس آنٹی سے وعدہ کیا تھا کہ میں مذہب نہیں چھوڑوں گا لیکن اگر میں نرس آنٹی سے وعدہ بھی نہ کرتا تو بھی شاید مذہب نہ چھوڑ سکتا۔

ایک بار لیزا بہت دیر تک مجھ سے اس موضوع پر بات کرتی رہی تھی کہ پاکستانی لڑکے جب یہاں کی لڑکیوں سے شادیاں کرتے ہیں تو انہیں مذہب چھوڑنے پر مجبور کرتے ہیں' ان کا نام بدل دیتے ہیں حالانکہ وہ خود بھی اپنے مذہب سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوتے۔

لیزا بہت اچھی سچی اور محبت کرنے والی لڑکی تھی' اسے ہمارے ہاں کی یہ روایت بہت پسند تھی کہ یہاں اکثر شادیاں والدین کی پسند پر ہوتی ہیں اور طلاقیں بہت کم ہوتی ہیں۔ میں نہ لیزا کو آزمائش میں ڈالنا چاہتا تھا نہ خود کو اور نہ ہی احسان فراموش کہلوانا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے پاکستان واپس آنے کا فیصلہ کر لیا۔

سرجان اور لیزا میرا فیصلہ سن کر شاک کی سی کیفیت میں مجھے دیکھتے رہ گئے۔ کچھ دیر بعد سرجان نے پوچھا۔

"بٹ وائے سکندر؟ تم تو یہاں سیٹ ہو۔ بہت اچھی جاب ہے پھر۔۔۔ وہاں تمہارا کون ہے؟"

"کوئی نہیں۔"

میں نے لیزا کی طرف دیکھا جس نے آج بلیک ٹراؤزر پر ریڈ شرٹ پہن رکھی تھی اور بہت دلکش لگ رہی تھی وہ ابھی تک سکتے کے عالم میں بیٹھی تھی جیسے اسے میری بات کا یقین نہ ہو۔ اس نے اپنی سبز آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں مجھے لگا جیسے میں ان آنکھوں کے سحر میں جکڑا جاؤں گا۔

بمشکل میں نے اپنی نظریں اس کی آنکھوں کے سحر سے آزاد کیں اور سرجان کی طرف دیکھا۔

"سر آپ نے ایک بار کہا تھا کہ ایک وقت آتا ہے جب آدمی اپنی اصل کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اجنبی تہذیب اور ماحول اسے بیزار کر دیتے ہیں۔"

میں نے بارہ سال پہلے سرجان کی کہی ہوئی بات دہرا دی۔ تو سرجان نے پھر اس پر کوئی بحث نہیں کی۔ البتہ میرے آنے سے ایک دن پہلے کہا۔

"سکندر! جب بھی محسوس کرو کہ تنہا ہو گئے ہو۔ جب کسی اپنے کی ضرورت محسوس ہو تو لوٹ آنا ہم تمہیں منتظر ملیں گے۔"

لیزا اداس تھی۔ اس نے مجھے رکنے کو نہیں کہا تھا لیکن اس کا ہر انداز مجھے روک رہا تھا۔ مگر میں نے اس سے نگاہیں چرائیں اور اسے روتا ہوا چھوڑ کر وطن لوٹ آیا۔ اگرچہ سرجان نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس سے رابطہ رکھوں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ لیزا مجھ سے مایوس ہو کر شادی کر لے۔

♥ ♡ ♡ ♥

پاکستان میں سوائے نرس آنٹی کے میرا کوئی نہیں تھا۔ سو میں ہوٹل میں سامان رکھ کر سیدھا ہاسپٹل گیا تھا اور ہاسپٹل سے نکل کر بلا ارادہ ہی میرے قدم "علوی ہاؤس" کی طرف چل پڑے تھے۔ پتا نہیں کیوں حالانکہ میں جانا نہیں چاہتا تھا وہاں۔

میں نے کبھی ایک لمحے کو بھی نہیں سوچا تھا کہ میں

کبھی دوبارہ ان لوگوں کو دیکھوں گا یا ان سے ملوں گا حالانکہ لیزا مجھ سے اصرار کرتی رہتی تھی کہ میں پاکستان جا کر اپنے حق کا مطالبہ کروں۔۔۔ آخر میں حمید اللہ کا بیٹا ہوں اور جتنا حق نجیب' حبیب اور اسمارہ کا ہے اتنا ہی میرا بھی ہے۔۔۔ لیکن میں ہمیشہ کہتا تھا' مجھے سرجان کی محبت اور تمہاری دوستی مل گئی ہے اور اس سے قیمتی اور کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔ لیکن جب میں علوی ہاؤس کے سامنے ٹیکسی سے اترا تو خود ایک لمحہ کو حیران رہ گیا۔۔۔ پھر میں نے سیاہ گیٹ کے سامنے رک کر کال بیل پر ہاتھ رکھ دیا حالانکہ ایک لمحہ پہلے میرے دل میں خیال آیا تھا کہ واپس پلٹ جاؤں لیکن جب میں نے کال بیل پر ہاتھ رکھا تو میرے اندر ایک عجیب کمینی سی خوشی رقص کرنے لگی۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران ہو جائیں گے سب۔۔۔ شاید ڈر جائیں۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے سراپے کے متعلق سوچا۔۔۔ میں اب گیارہ سال کا کمزور بچہ نہ تھا' میں سال ہو چکا تھا۔ مضبوط اعصاب کا حامل جسم جو کراٹے اور یوگا کی مشقوں نے مجھے دشمن سے نمٹنا سکھایا تھا۔۔۔ میرے دل میں شدت سے خواہش پیدا ہوئی کہ آج نجیب اللہ مجھ پر ہاتھ اٹھائے اور میں اس کا ہاتھ اس کے جسم سے علیحدہ کر کے پھینک دوں۔

میں اتنے سالوں سے جو بھولا ہوا تھا۔ وہ سب وہاں گیٹ پر کھڑے کھڑے میں نے یاد کر لیا۔ میرے اندر ایک تیز آگ بھڑک اٹھی۔۔۔ تب ہی چوکیدار نے گیٹ کی کھڑکی سے جھانکا۔

"کون؟" یہ چوکیدار رہا تھا۔۔۔

"سکندر! اندر جا کر بتاؤ کہ سکندر علوی آیا ہے۔ حمید اللہ علوی کا بیٹا۔"

میں نے مزید وضاحت کی۔

میری وضاحت پر اس نے ایک لمحہ کو ٹھٹھک کر مجھے دیکھا اور پھر کندھے اچکاتا ہوا اندر چلا گیا اور وہاں انٹرکام پر اندر بات کی۔ اور پھر مڑ کر گیٹ کھول دیا۔

"آئیے۔"

سامنے صوفے میں دھنسی وہ رقیہ علوی تھیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ بارہ سالوں میں وہ اتنی بدل جائیں گی۔ وہ بے حد کمزور اور بوڑھی لگ رہی تھیں۔ اور جب انہوں نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور میری طرف اشارہ کیا تو ان کا ہاتھ لرز رہا تھا۔

"تم سکندر ہو۔۔۔ افزا کے بیٹے۔"

"صرف افزا کا ہی نہیں حمید اللہ کا بھی بیٹا۔"

میں جب بولا تو مجھے خود یوں محسوس ہوا جیسے میرے لہجے میں سانپ کی سی پھنکار ہو۔

"اپنا حصہ لینے آئے ہو؟" انہوں نے ہاتھ نیچے کر لیا۔ "کل وکیل کو لے آنا اور اپنا حصہ لے لینا۔"

میں ایک لمحہ کو حیران رہ گیا۔

"بیٹھ جاؤ۔"

انہوں نے پھر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں نے ان کے ہاتھوں میں واضح لرزش محسوس کی۔ شاید انہیں کسی طرح کی بیماری تھی۔

"تمہارا وکیل کاغذات تیار کرے گا پھر عدالت دیکھیں جہاں جو کچھ کرنا ہو کر لینا۔"

ان کی آواز میں بہت شکستگی سی تھی۔ میں حیران سا بیٹھا تھا۔

"میں عدالت نہیں جا سکوں گی اور۔۔۔"

انہوں نے پھر کہا تو بے اختیار میرے ہونٹوں سے پھسل پڑا۔

"نجیب اللہ اور حبیب اللہ کہاں ہیں؟"

"نجیب اللہ اس دنیا میں نہیں ہے اب اور۔۔۔"

ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ "تمہارے جانے کے کچھ ہی دنوں بعد اسمارہ نے اپنی مرضی سے اپنی ایک سہیلی کے بھائی سے کورٹ میرج کر لی۔ نجیب تو ہمیشہ سے ہی غصے کا تیز ہے۔ پتا نہیں کیوں۔۔۔ جب حمید اللہ نے شادی کی تھی تب بھی وہ ایسے ہی غصے میں بھر گیا تھا اور بار بار دراز سے ماؤزر نکال لیتا اور کہتا میں ابھی جا کر افزا کو اور ڈیڈی کو شوٹ کر دوں گا۔ وہ تو میں ہی اسے سنبھالے رکھتی۔۔۔ وہ غصے میں چیزیں توڑتا پھوڑتا رہا۔۔۔"

www.allurdu.com

میری محبت اسی طرح تر و تازہ تھی۔ میں ہر رات سونے سے پہلے اسے ضرور یاد کرتا تھا۔ اور پھر اس کی موت اور نجیب اللہ علوی اس کا قاتل۔ غصہ میری رگوں میں بل کھاتا اور میں دل ہی دل میں سوچتا تھا کہ زندگی نے اگر موقع دیا تو میں بھی نجیب اللہ علوی کے ساتھ ایسا ہی کروں گا۔۔۔

لیکن اب تو کھیل ختم ہو چکا تھا۔ زندگی بہت بدل ہو گئی تھی۔ لیکن کبھی کبھی اس خیال سے مجھے تقویت ہوتی کہ میں نے اگرچہ دل میں رقیہ علوی کو معاف کر دیا تھا لیکن زبان سے نہیں۔۔۔ اور یہ احساس کہ میں نے انہیں معاف نہیں کیا تھا۔۔۔ انہیں اذیت دیتا ہوگا۔۔۔ وہ اور نجیب اللہ حیران تو ہوتے ہوں گے کہ میں اتنی بڑی جائیداد کو چھوڑ کر چلا گیا ہوں۔ شاید وہ سوچتے ہوں کہ میں کسی دن پلٹ آؤں گا۔ اور یہ انتظار انہیں جھنجلاتا ہو۔ تکلیف دیتا ہو۔ اس احساس سے میں خود کو خوش کرنے کی کوشش کرتا لیکن یہ خوشی وقتی ہوتی۔

تھوڑی دیر بعد ہی یہ خوشی ختم ہو جاتی اور میں اندر ہی اندر گھٹتا چلا جاتا۔ میرے سامنے کوئی ٹارگٹ نہ تھا میں اپنا غصہ اپنے ماتحتوں پر نکالتا۔۔۔ چھوٹی سی بات پر ان کی تذلیل کر کے خوش ہوتا۔ اور جب وہ بے بس ہو کر سر جھکا لیتے تو مجھے بڑی کمینی سی خوشی ہوتی۔ میں بالکل غیر محسوس طریقے پر اپنا غصہ اور ایگریشن اس طرح کم کرنے لگا۔ حالانکہ ہالینڈ میں ایسا نہ تھا۔۔۔ کبھی کبھار ایسا ہوتا تھا کہ میں غصیلا ہو جاتا‘ لیکن لیزا اگر ہوتی تو مجھے فوراً ”ٹھنڈا“ کر لیتی تھی۔۔۔ مگر اب تو میں ہر وقت ہی غصے میں بھرا رہتا لیکن چونکہ میرا کام بہت اچھا تھا میں بہت دل لگا کر اور لگن سے کام کرتا تھا اس لیے میرا باس مجھ سے بہت خوش تھا اور میری چھوٹی موٹی کوتاہیوں کو نظر انداز کرتا تھا میں نے دو تین پراجیکٹ بڑی کامیابی سے اور بہت کم عرصے میں مکمل کروائے تھے اس لیے سعد خان دل سے میری قدر کرتا تھا۔

کبھی کبھار لیزا کا فون آ جاتا تھا۔۔۔ وہ مجھے ڈانٹتی بھی۔ واپس آنے کو بھی کہتی اور پھر جیسی تمہاری خوشی کہہ کر خدا حافظ کہہ دیتی۔ پتا نہیں میں لیزا سے محبت کرتا تھا یا نہیں میں نے اس پر کبھی غور نہیں کیا اور نہ ہی سوچا تھا۔

لیکن میں نے اوج کمال کے متعلق بارہا سوچا اور مجھے لگا میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔۔۔ ہمیں ایک نیا پراجیکٹ ملا تھا۔۔۔ ایک بڑے ہاسپٹل کی تعمیر کا۔۔۔ اور اس پراجیکٹ میں اوج کمال مجھے اسسٹ کر رہی تھی۔۔۔ اوج کمال اس کمپنی کی ملازم تھی اور اس سے پہلے کراچی آفس میں تھی۔ مجھے سب سے پہلے جس چیز نے متاثر کیا۔ وہ اس کی ذہانت تھی۔ سعد خان نے اس کا تعارف مجھ سے کرواتے ہوئے کہا تھا۔

”اوج کمال ہماری کمپنی کی ایک ذہین ورکر ہیں۔ آپ کو ان کے ساتھ کام کر کے مزہ آئے گا۔“

اور چند ہی دنوں میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ سعد خان نے بالکل صحیح کہا تھا۔

وہ بلا کی خود اعتماد تھی۔

بلا کی ذہین۔ اس کے اندر فوری فیصلہ کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ میری عدم موجودگی میں کئی بار اس نے اپنے طور پر کوئی فیصلہ کیا تو اس سے بہت فائدہ ہوا اور ہم کسی بڑے نقصان سے بچ گئے۔ میں نے دل ہی دل میں اس کی قوت فیصلہ کو از حد سراہا لیکن بظاہر اسے بہت ڈانٹا ڈپٹا۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس کی خود اعتمادی‘ اپنی ذات پر بھروسا اندر سے غصیلا کر دیتا تھا۔۔۔ سیکڑوں بار میں نے کیبر کے سامنے اس کی انسلٹ کر دی۔ بلاوجہ ڈانٹا لیکن جواب میں وہ صرف ایک ترحم بھری نظر مجھ پر ڈال کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔ میں اور جھنجلاتا اندر ہی اندر غصے سے بل کھا کر رہ جاتا۔۔۔ شاید میں ایک نفسیاتی مریض بنتا جا رہا تھا۔

میں اب صرف اوج کمال کو ہی نہیں سب کو ہی اپنے سامنے بے بس دیکھ کر طمانیت اور خوشی محسوس کرتا تھا۔ جب میرے ماتحت بے بسی سے مجھے دیکھتے تو

میں ان پر ایک حقارت بھری نظر ڈال کر اپنے اندر میں بہت پُرسکون ہو جاتا۔۔۔ صرف اوج کمال تھی جو میرے کسی بھی رویے پر بے بس نہ ہوتی تھی بلکہ وہ مجھے رحم اور ترس بھری نظروں سے دیکھتی میں اندر ہی اندر جلس کر رہ جاتا۔ گرم خون میری کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارتا اور وہ ٹھک ٹھک کرتی نخوت سے سر اٹھائے چلی جاتی۔

میرے اندر جیسے نجیب اللہ کی روح سما گئی تھی۔۔۔ اس روز میں نے ایک ذرا سی غلطی پر ایک مزدور کو تھپڑ مار دیا۔ اس نے میرے حکم کے باوجود سیمنٹ کی مقدار کم ڈالی تھی۔ وہ تھپڑ کھا کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔ اندر ہی اندر دل کھاتا غصہ تھا جو بے بسی میں ڈھل گیا تھا کہ وہ دوبارہ مجھے تھپڑ نہیں مار سکتا تھا ایک لمحہ کو مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ مزدور میں ہوں اور میری جگہ نجیب اللہ کھڑا ہے۔ اور میں جواباً نجیب اللہ کو تھپڑ نہیں مار سکتا اور بے بسی سے ہونٹ کاٹ رہا ہوں۔

”سکندر! تمہیں کیا پرابلم ہے؟“ میرے بالکل سامنے کھڑی اوج کمال مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ ”کبھی کبھی تم نفسیاتی مریض لگنے لگتے ہو۔“

”شٹ اپ“ میں نے غصے سے اسے دیکھا اور اسے وہیں سائیٹ پر چھوڑ کر واپس آفس آ گیا۔ حالانکہ وہ میرے ساتھ سائیٹ پر گئی تھی یہ جگہ جہاں ہاسپٹل بن رہا تھا شہر سے کافی دور مضافات میں تھی اور میں جانتا تھا کہ اس کے لیے کنوینس کا پرابلم ہو جائے گا۔۔۔ پھر بھی میں غصے میں اسے چھوڑ آیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب میرا غصہ کم ہوا تو میں دوبارہ اسے لینے چلا گیا۔ وہ وہاں سائیٹ پر موجود مزدوروں کے ساتھ بیٹھی مزے سے چائے پی رہی تھی۔

”اُف ہے مجھ پر! میں اسے یہاں اکیلا چھوڑ گیا تھا۔“ میں نے خود کو ڈانٹا۔

”سکندر! تم آخر اس قدر غصے میں کیوں رہتے ہو۔“

اس کا لہجہ بہت نرم اور میٹھا تھا‘ بالکل لیزا کی طرح‘ میں نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی اوج کمال کو ذرا سا رخ موڑ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک نرم سا تاثر تھا۔ اس کی آنکھیں بہت دلکش تھیں۔ میں نے پہلی بار ان آنکھوں کو غور سے دیکھا۔ یکدم سیاہ ”آتی“ گھور سیاہ آنکھیں اور ان میں بے تحاشا چمک۔ اس کی رنگت صاف تھی اور میرے مسلسل دیکھنے سے چہرے پر گلابی پن جھلک آیا تھا۔ اس کے ہونٹ بے حد دلکش تھے۔ لپ اسٹک سے بے نیاز ان ہونٹوں پر ہلکی سی نمی تھی۔

دوسرے مسلسل دیکھنے سے وہ اور گلابی ہوئی اور بے اختیار اس کی پلکیں جھک گئیں۔ سپیج رخساروں پر ان کا سایہ بہت دلفریب لگ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک حسین اور خوبصورت لڑکی تھی۔ دل کی دھڑکن کو یکدم ابنارمل کر دینے والی۔

”تمہارے ساتھ یقیناً“ ماضی میں کچھ اچھا نہیں ہوا لیکن سکندر! اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا بدلہ ہم دوسروں سے تو نہیں لے سکتے۔“

ابھی کچھ دیر پہلے کا وہ قریب احساس جس نے دل کو گرفت میں لے رکھا تھا یکدم ذہن سے محو ہو گیا اور اندر ہی گرم ہوائیں چلنے لگیں۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے اور تخت لہجے میں اسے تنبیہ کی۔

”مس اوج کمال! میں ذاتیات پر گفتگو پسند نہیں کرتا۔ آئندہ اس سے گریز کیجئے گا۔ میں تو بس دوبارہ آپ کو لینے آیا ہوں تو محض اپنا فرض اور ذمہ داری جان کر۔۔۔ آپ کے حسن سے متاثر ہو کر نہیں۔“

ایک لمحہ کو میری نگاہوں نے اس کی نظروں کو چھوا‘ جہاں ایک لمحہ کو حیرت ابھر کر معدوم ہو گئی تھی اور رخساروں کی گلابیاں زرد پڑ گئی تھیں۔

میں نے اپنے اندر وہی کمینی سی خوشی پھیلتے دیکھی۔

میں نے اوج کمال سے تو کہہ دیا تھا کہ میں اس کے حسن سے متاثر نہیں ہوں لیکن جب اسد اور اس کی بیوی میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے کہ مجھے اب شادی کر لینی چاہیے تو میری آنکھوں کے سامنے بار بار اوج

www.allurdu.com

ان کی آواز بھرا گئی تھی اور آنسو تیزی سے بہنے لگے تھے۔ میں ساکت بیٹھا ان کی بات سن رہا تھا۔ کچھ دیر انہوں نے سنبھلنے میں لگائی اور پھر خود پر قابو پا کر بولیں۔

"وہ اپنی ایک سہیلی کے بھائی کو پسند کرتی تھی اور اس سے شادی کرنا چاہتی تھی ان لوگوں نے رشتہ بھی بھیجا لیکن نجیب نے انکار کر دیا۔۔۔ اس کا خیال تھا کہ خاندانی لحاظ سے وہ لوگ ہمارے ہم پلہ نہیں ہیں۔ تب اس نے کورٹ میرج کر لی اور جانے سے پہلے وہ میرے نام خط لکھ کر چلی گئی۔ میں گھر پر نہ تھی۔ نجیب اللہ نے آفس سے آ کر سہیل پر دھاوا بولا تھا اور غصے میں بھر گیا۔ ماؤزر اٹھایا اور یوں ہی الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔ گاڑی میں مجیب بھی تھا۔ دونوں نے کسی فنکشن میں جانا تھا اور وہ مجیب کو گاڑی میں چھوڑ کر اندر ڈریس کو بتانے گیا تھا کہ وہ رات ڈنر کر کے آئیں گے۔ لیکن ٹی وی لاؤنج سے واپس پلٹ گیا۔ بھرا ہوا ماؤزر ہمیشہ اس کے پاس ہی رہتا تھا۔ ایک بار ڈاکوؤں نے گاڑی روک کر لوٹنے کی کوشش کی تھی تب سے وہ ماؤزر پاس ہی رکھتا تھا۔۔۔ وہ غصے سے بھرا ہوا باہر نکلا تھا۔ مجیب نے پوچھا تو مختصراً کہا کہ اسماء اور سہیل کو مارنے جا رہا ہوں۔۔۔ مجیب کو ابھی تفصیل معلوم بھی نہ ہوئی تھی اور وہ اسے ٹھنڈا ہونے کے لیے کہہ ہی رہا تھا کہ گاڑی سامنے آتے ٹرالر سے ٹکرا گئی۔ وہ غصے میں بہت ریش ڈرائیونگ کر رہا تھا اور۔۔۔ وہ ایسا ہی تھا۔ بچپن سے غصیلا اور تنک مزاج۔ ذرا سی بات مزاج کے خلاف ہوئی تو چیزیں پھینکنے اور توڑنے لگتا۔"

وہ پھر رونے لگیں۔ اب کے ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

میں ابھی تک حیران تھا۔ ہر طرح کے احساس سے عاری۔ خاموشی سے انہیں روتا دیکھ رہا تھا۔

"نجیب تو وہاں ہی دم توڑ گیا تھا اسٹیرنگ اس کے سینے میں گھس گیا تھا اور مجیب کی ٹانگیں کچلی گئیں۔ گینگرین کا خطرہ تھا اس لیے کاٹنی پڑیں۔"

کچھ دیر بعد انہوں نے کہا۔

"مجیب اندر ہے اپنے کمرے میں۔ ہر وقت بستر پر لیٹے لیٹے چڑچڑا اور بد مزاج ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کچھ دیر پہلے ہی نیند کا انجکشن دے کر گیا ہے۔

تم۔۔۔ ہمیں معاف کر دو سکندر۔ ہم نے افزا کے اور تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی۔ افزا سے وہ پوچھنا جو اس کا تھا۔"

ایک بار نرس آنٹی نے افزا علوی سے کہا تھا۔

"میں نے اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا ہے اور وہ بہت انصاف کرنے والا ہے۔"

"واقعی خدا سے بڑا منصف کوئی نہیں۔"

میں یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ گھر جائیداد یہ لاہور کے فلیٹ بزنس سب تمہارا اور مجیب کا ہے۔ بزنس منیجر سنبھالتا ہے۔ مجیب معذور ہے تم سارا بزنس سنبھالو۔۔۔ میں نے اسماء کو اس کا حصہ دے دیا تھا۔۔۔ جب وہ امریکہ جانے سے پہلے مجھ سے ملنے آئی تھی۔ وہ گیارہ سال سے امریکہ میں ہی سیٹل ہے۔۔۔ میں اپنا حصہ بھی تمہارے نام کرنا چاہتی ہوں۔۔۔ شاید اس طرح تلافی ہو جائے ان زیادتیوں کی جو ہم نے تم سے روا رکھیں۔"

"کیا اس طرح تلافی ہو سکتی ہے؟"

میں نے اپنے آپ سے سوال کیا اور رقیہ علوی کی طرف دیکھا جو میری طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔

"سکندر! کیا تم نے ہمیں معاف کر دیا؟"

"میں صرف ان زیادتیوں کے لیے آپ کو معاف کر سکتا ہوں مسز حمید اللہ علوی! جو آپ نے میرے ساتھ کیں۔ لیکن جو کچھ آپ نے افزا کے ساتھ کیا اس کے لیے تو وہی معاف کرنے یا نہ کرنے کی مجاز ہے۔ میں نہیں۔"

میں نے دل ہی دل میں سوچا اور رقیہ علوی کی بات کا جواب دیے بغیر وہاں سے چلا گیا۔۔۔ یہ شہر میرا تھا۔ لیکن یہاں میرا دم گھٹ رہا تھا۔ مجیب سا بوجھ ذہن و دل پر آ گرا تھا۔

میرا غصہ میری نفرت میرے اندر ہی منجمد ہو گئی

تھی۔۔۔ میں نے سوچا تھا نجیب اللہ اور مجیب اللہ کو عدالت میں گھسیٹوں گا۔ بھلے سے میرا حق مجھے نہ ملے لیکن میں ان کی جھنجلاہٹ کو انجوائے کروں گا۔ انہیں زچ کر کے لطف اٹھاؤں گا۔ لیکن میرا سارا غصہ میرے اندر ہی اندر گھل کھا کر رہ گیا تھا۔ کھیل ختم ہو گیا تھا۔ مجھے اپنا جینا اپنی زندگی اور وجود بے معنی سا لگنے لگا تھا۔

میں نے ہوٹل سے اپنا سامان سمیٹا اور لاہور اور ایک دوست کی طرف جانے کے لیے ہوٹل سے نکل پڑا۔

اسد ملک مجھے ہالینڈ میں ملا تھا۔۔۔ وہ یونی سیف کے اسکالر شپ پر وہاں اعلا تعلیم حاصل کرنے آیا تھا۔ ہم نے ایم ایس کا کورس اکٹھا ہی مکمل کیا تھا۔ اور پھر ایم فل کی ڈگری بھی اکٹھی ہی لی تھی۔ تھیسس کے لیے ہمارا ٹاپک ملتا جلتا تھا۔ میں نے اسلامی آرکیٹیکٹ کو موضوع بنایا تھا جب کہ اس کا موضوع مغل طرز تعمیر تھا۔ میرے غصے اور مزاج کی وحشت کے باوجود وہ مجھے دوست ہی سمجھتا تھا۔ اور میرے مزاج کے وحشیانہ پن کو بھی برداشت کر لیتا تھا جب وہ پاکستان واپس آ رہا تھا تو اس نے بار بار مجھے تاکید کی تھی کہ میں جب بھی پاکستان آؤں تو اس کے پاس لاہور ضرور آؤں۔

لیزا، سرجان اور نرس آنٹی کے علاوہ اسد ملک کے لیے بھی میرے دل میں ایک نرم گوشہ تھا۔ مجھے دولت اور جائیداد کی ضرورت نہ تھی۔ میرے پاس بہت کچھ تھا۔ میں تقریباً چار سالوں سے جاب کر رہا تھا اور میرے اکاؤنٹ میں بہت رقم تھی۔ میرے اخراجات نہ ہونے کے برابر تھے۔ سو میں نے یہ شہر چھوڑ دیا۔۔۔ جہاں میرے بہت سارے حساب کتاب تھے اور لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔

پاکستان آنے سے پہلے میں نے اسد کو ای۔میل کر دیا تھا۔ لیکن اپنے آنے کی تاریخ نہیں لکھی تھی۔ بس اتنا ہی کہا تھا کہ میں بہت جلد پاکستان آ رہا ہوں اور وہاں ہی سیٹل ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ سو وہ مجھے دیکھ کر حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ گویا اس ملک میں نرس آنٹی کے علاوہ اسد ملک بھی تھا جو مجھے دیکھ کر خوش ہو سکتا تھا۔ خوشگوار سی حیرت کے ساتھ میں اس کے پاس بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا۔۔۔ وہ بہت پرجوش ہو رہا تھا۔ اس کے پاس بہت سارے پلان تھے۔ لیکن مجھے فوری طور پر جو بات مناسب معلوم ہوئی وہ اس کی کمپنی میں جاب تھی۔

"تمہاری اس کنسٹرکشن کمپنی میں تمہارے لیے جاب ہے۔ ابھی چند دن پہلے ہمارے ایک سینئر انجینئر اینڈرسن جاب چھوڑ کر امریکہ گئے ہیں۔ دیکھو جب چاہو تو اپلائی کر دو۔"

یہ کنسٹرکشن کمپنی امریکہ کی ہی ایک پارٹی کے تعاون سے سعد خان نے قائم کی تھی اور اس کا کام یو اے ای اور سعودی عرب تک میں ہوتا تھا۔۔۔ یو اے ای اور سعودیہ میں بھی اس کے آفس موجود تھے۔ سعد خان نے مجھے فوراً سلیکٹ کر لیا تھا اور دوسرے دن سے ہی کام پر آنے کو کہہ دیا تھا۔

میں چند دن اسد کے ساتھ رہا۔ اگرچہ اسد کی بیوی بہت خوش اخلاق تھی۔ بچہ تھا ایک دو سال کا۔ اور دونوں نے ہی ضد کی تھی کہ میں ان کے ساتھ ہی رہوں بلکہ اسد کی بیوی نے فوراً ہی خواتین کی فطرت کے مطابق میری شادی کروانے کے پروگرام بھی بنا ڈالے تھے۔ لیکن میں نے اس طرح ساتھ رہنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور جلد ہی شادمان میں ایک فلیٹ کرائے پر لے کر وہاں منتقل ہو گیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

زندگی کی ایک نئی روٹین شروع ہو گئی تھی۔ میں نے نجیب اللہ، حمید اللہ، رقیہ علوی سب کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ میں افزا علوی اور حمید اللہ علوی کو بھی نہیں سوچتا تھا۔۔۔ میرے دل میں ان کے لیے کوئی جذبہ بیدار نہ ہوتا تھا لیکن ہاں اب بھی میرے تصور میں چلا آتا تھا۔۔۔ کبھی کاٹ میں پڑے انگوٹھا چوستے ہوئے اور کبھی دوکٹ میں چھپائے ہوئے پینگ کرتے یا ہاؤنگ کرتے۔ افزا علوی اور حمید اللہ کے لیے میری محبت ختم ہو گئی تھی۔ بہت ساری نفرتوں اور غصے کے انبار تلے دب گئی تھی۔ لیکن ماں کے لیے

www.allurdu.com

کمال آنے لگی۔

"یار! تمہیں اس اکیلے گھر میں وحشت نہیں ہوتی؟"

اسد نے کہا تو میرے بجائے اس کی بیوی نے جواب دیا۔

"وحشت کیوں نہیں ہوتی ہوگی۔۔۔ میں نے تو سوچ لیا ہے میں اب سکندر بھائی کی کوئی بات نہیں سنوں گی۔۔۔ حد ہو گئی ہے۔ اپنا کچھ خیال ہی نہیں۔۔۔ سنیں سکندر بھائی! کل شام کو آپ ہماری طرف آئیے گا۔۔۔ میں ایک لڑکی سے آپ کو ملواؤں گی۔ ہمارے پڑوس میں رہتی ہے بہت کیوٹ سی ہے۔ آپ کو پسند آئے گی۔"

"تم بھی کمال کرتی ہو یار! لڑکی بھی پسند کرنے لگیں۔ پہلے سکندر سے تو پوچھ لو کہ اسے کوئی پسند تو نہیں ہے۔ کیا خبر حضرت کہیں دل وِل لگا بیٹھے ہوں۔" اسد نے بیوی کو ٹوکا۔

"اگر ایسی کوئی بات ہے بھائی تو بتا دیجیے ہم آج ہی جھولی پھیلانے چلے جاتے ہیں۔ بھلا کون انکار کرے گا۔ اتنا خوبصورت۔"

اسد ہولے سے کھانسا "بیوی ہمارے سامنے ہی غیر کی تعریف۔۔۔"

"فضول باتیں نہیں۔" اس نے ٹوک دیا۔ "ہاں بتایئے نا سکندر بھائی۔ اگر کوئی ہے تو نہیں تو میری پسند کی ہوئی لڑکی سے شادی کرنا پڑے گی بس۔۔۔"

"اوج۔۔۔ اوج کمال۔" بے اختیار میرے لبوں سے پھسل پڑا۔

"ارے تھمتے۔۔۔" اسد نے میری پیٹھ پر دھموکا مارا۔ "یعنی معاملہ یہاں تک پہنچ گیا اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی وہاں تو آفس میں اور سائیٹ پر بے چاری کا خون خشک کیے رکھتے ہو۔ لگتا ہے جیسے اس دنیا میں تم سے بڑا دشمن اس کا کوئی اور نہیں ہے۔"

"نہیں یار!" میں جھینپ گیا "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے یا نہیں۔۔۔ وہ کہیں انٹرسٹڈ ہے۔ اس کا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے۔ اور آج سے پہلے میں نے کبھی اس کے لیے اس طرح نہیں سوچا لیکن ابھی جب بھابھی نے کہا تو میرے ذہن میں اس کا خیال آیا خود بخود ہی کہ بجائے ادھر ادھر بھٹکنے کے۔۔۔"

"ہاں یار! تمہارے ذہن میں بالکل صحیح خیال آیا ہے۔ وہ ایک بہترین لڑکی ہے ہر لحاظ سے۔ خوبصورت، خوب سیرت اور مضبوط کردار کی۔۔۔ تمہارے لیے ایک ایسی ہی لڑکی ہونا چاہیے تھی۔" اسد نے تبصرہ کیا۔

میری زبان سے اوج کا نام پھسل تو گیا تھا لیکن اب میں متذبذب سا تھا۔

"پتا نہیں اوج مجھے پسند بھی کرتی ہے یا نہیں۔"

"تمہارا جو سلوک اس کے ساتھ رہا ہے اس حساب سے تو اس کو تمہیں ناپسند ہی کرنا چاہیے لیکن ان لڑکیوں کی قوم کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ سو رائی کر لیتے ہیں۔" اسد کچھ شوخ ہو رہا تھا۔

دونوں خوش تھے پلان بنا رہے تھے۔ اسد کی بیوی نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ اب یہ ان کا مسئلہ ہے اور انشاء اللہ بہت جلد اوج کمال اگر وہ پہلے سے منگنی شدہ نہیں ہے تو دلہن بن کر میرے سنگ ہوگی۔ لیکن میری کیفیات کیا تھیں یہ مجھے اس کی خبر نہ تھی۔

میں نے اپنے اندر جھانکا تو وہاں سناٹا تھا۔ گہرا اور لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہوا سناٹا۔

شادی میرے پلان میں کہیں نہیں تھی۔ میں جب ہالینڈ سے چلا تھا تو میرے ذہن میں صرف یہ تھا کہ میرے جانے کے بعد مایوس ہو کر لیزا شادی کر لے۔ دوسرے مجھے یہ بھی خوف تھا کہ کہیں سرجان نے اگر کسی روز خود اپنی زبان سے مجھ سے کہہ دیا کہ لیزا سے شادی کر لو تو میں انکار نہ کر سکوں گا۔۔۔

لیزا نے کہا "اچانک سب چھوڑ دو تو کوئی راستہ نجات کا نہیں ہوگا۔ سب دروازے بند ہو جائیں گے تب میرے لیے کوئی جائے فرار نہیں ہوگی۔

یا پھر شاید میں یہاں آ کر نجیب اللہ کو تنگ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے جہاز میں کتنے ہی پلان بنائے تھے کہ ملک

کے سب سے بڑے وکیل کو ہائر کروں گا اور جانے کیا کیا۔۔۔ لیکن سب کچھ بے فائدہ تھا۔۔۔ اور اب میں نہ صرف شادی کے لیے رضامند ہو گیا تھا بلکہ اس کے لیے اوج کمال کا نام بھی تجویز کر دیا تھا۔

کیا میں اوج کمال سے محبت کرتا تھا؟

کیا مجھے بھی خالی گھر سے وحشت ہونے لگی تھی؟

اگر میں اوج کمال سے محبت نہیں کرتا تھا تو کیا اس سے متاثر تھا؟ اس وقت میرے پاس کسی سوال کا جواب نہ تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اسد کی بیوی نے جو کچھ کہا تھا کر دکھایا اور چند ہی دنوں بعد میں اسد کے ساتھ اوج کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ اوج کے ڈیڈی نے مجھے شام کی چائے پر بلایا تھا۔

"ننانوے پرسنٹ امید ہے۔" اسد کی بیوی نے کہا۔ "یہ تو محض رسمی بات ہے ظاہر ہے لڑکی کے والدین کا حق ہے کہ کوئی بھی مثبت جواب دینے سے پہلے لڑکے سے مل کر اور اسے دیکھ کر تسلی کر لیں۔"

اس نے مزید وضاحت کی۔

"ویسے بھی میں نے سکندر بھائی کی بے حد تعریف کی ہے اور ساتھ ہی کہہ دیا ہے کہ اوج سے بھی وہ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ وہ اس کی کولیگ ہے۔"

اوج کے والد کمال صاحب ایک شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے لیے گریس فل کہنا مناسب ہوگا۔ نرم اور شفیق لہجے میں بات کرتے تھے اور کوئی چند لمحوں بعد ہی ان کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ وہ مجھ سے کافی دیر تک میری تعلیم اور میری جاب کے متعلق پوچھتے رہے۔ میں نے ان کی آنکھوں میں اپنے لیے ایک واضح تحسین محسوس کی۔

گفتگو کا رخ تعلیم سے ہٹ کر فیملی کی طرف مڑا تو میں نے بتایا کہ میرا کوئی قریبی عزیز نہیں ہے۔ سوتیلی والدہ اور بھائی ہے لیکن میرا ان سے کوئی تعلق وغیرہ نہیں ہے۔ لہٰذا اسد اور بھابھی کو ہی سب کچھ کرنا ہے۔

"پھر بھی ننھیال ددھیال میں کوئی تو ہوگا۔" انہوں نے پوچھا۔

"بدقسمتی سے میری والدہ کے والدین ان کے بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے اور ان کی پرورش ان کے دور کے عزیزوں نے کی تھی یہی وجہ تھی کہ انہوں نے میری والدہ کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی جو پہلے سے شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ تھا۔"

میرے لہجے میں غیر اختیاری طور پر تلخی آ گئی تھی۔

"میرے والد حمید اللہ علوی کا انتقال میرے بچپن میں ہو گیا تھا۔ گیارہ سال کی عمر میں میری والدہ بھی وفات پا گئیں۔"

میں نے تفصیل بتائی اور میں نے محسوس کیا کہ حمید اللہ علوی کا نام سن کر وہ ذرا سا چونک گئے تھے۔

"آپ کی والدہ کا نام؟" انہوں نے پوچھا۔

"افزا علوی۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ مضطرب سے ہو گئے ہیں۔ اضطراب اور بے چینی ان کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ پھر وہ کچھ دیر تک مزید سوالات کرتے رہے۔ جن میں زیادہ تر سوال میری ایجوکیشن کے متعلق ہی تھے کہ میں نے کہاں اور کیسے رہ کر تعلیم حاصل کی۔ میں نے زیادہ تفصیل سے گریز کرتے ہوئے مختصراً بتایا کہ میری ایجوکیشن کی ذمہ داری میرے ایک محترم استاد نے سنبھال لی تھی۔

چائے کے دوران انہوں نے ریلیکس موڈ میں بتایا کہ وہ بھی ایک طویل عرصے تک اسی محلے اور اسی شہر میں رہے ہیں۔ مگر حمید اللہ علوی کو انہوں نے دیکھا نہیں تھا لیکن نام سے جانتے ہیں۔

چائے بہت خوشگوار ماحول میں ختم ہوئی اوج کی ممی بھی ایک نفیس خاتون تھیں۔

"اوج ہماری اکلوتی بیٹی ہے۔ ایک بیٹا بھی ہے۔ جو میرے بھائی کا بیٹا ہے۔ لیکن اوج کی تنہائی کے خیال سے میں نے اسے بچپن میں ہی گود لے لیا تھا۔ آج کل وہ آسٹریلیا گیا ہوا ہے۔ اوج سے ایک سال چھوٹا ہے۔"

www.allurdu.com

انہوں نے بتایا اور بہت دیر تک اوج اور بلال کے بچپن کی باتیں کرتی رہیں۔ کچھ دیر بعد ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ کمال اور بیگم کمال نے بہت گرم جوشی سے ہمیں رخصت کیا۔

"حالات بہت امید افزا ہیں۔" واپسی پر اسد نے تبصرہ کیا۔

لیکن میں خاموش ہی رہا۔ پتا نہیں کیوں مجھے کمال صاحب کچھ مضطرب اور بے چین لگ رہے تھے۔ شاید ایک تنہا اکیلے لڑکے پر بھروسا کرتے ہوئے متذبذب تھے۔ میرا خیال تھا کہ شاید کمال صاحب معذرت کرلیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا اور اسد کا خیال صحیح نکلا۔ چند دن بعد اسد اور اس کی بیوی مٹھائی کے ڈبے اٹھائے اور مبارک مبارک کا شور کرتے ہوئے میرے فلیٹ میں داخل ہوئے۔ میں اس وقت سویا تھا شام چھ بجے ہی سائٹ سے آیا تھا اور اب تھک کر سو رہا تھا۔

"کیا صبح تک صبر نہیں کرسکتے تھے تم؟" میں نے اسد کو جھاڑا۔

"ابھی صرف نو بجے ہیں بھائی! آٹھ بجے میں نے اوج کے گھر فون کیا تھا۔" اسد کی بیوی چہکی۔ "اور ہم سے صبر نہیں ہوسکا۔ جوں ہی کمال صاحب نے بتایا کہ انہیں آپ کا پرپوزل قبول ہے تو ہم۔۔۔"

"خوشی سے ناچنے لگے۔" اسد نے اس کی بات کاٹ دی۔

میں برا سا منہ بنا کر آنکھیں ملتا ہوا بیٹھ گیا۔

"تم انتہائی ناشکرے آدمی ہو۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو خوشی سے بھنگڑا ڈالتا۔"

"آپ برائے مہربانی میری جگہ تم ہی بھنگڑا ڈال لو۔"

میں نے بمشکل اپنا موڈ بحال کیا۔ واش روم میں جا کر پانی کے چھینٹے مارے، آنکھیں تب کہیں جا کر کھلیں۔

"بلاشبہ اوج ایک انتہائی خوبصورت اور ذہین لڑکی ہے۔ آپ بہت خوش قسمت ہیں سکندر بھائی آپ کی چاند سورج کی جوڑی ہے۔"

اسد کی بیوی بھی بے حد خوش تھی۔ وہ دونوں بہت دیر تک شادی کے پلان بناتے رہے اور اسد نے تو باقاعدہ بھنگڑا ڈالا اور بے سری آواز میں گاتا رہا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ میں ان کی خوشی کو تھوڑا بہت شیئر کروں تاکہ انہیں اپنے خلوص کے رائیگاں جانے کا احساس نہ ہو۔ مگر شاید اس میں ناکام رہا تھا تب ہی تھکن کا بہانہ بناتے بناتے اسد نے پوچھ لیا۔

"سکندر! تم خوش نہیں ہو کیا؟"

"نہیں ٹھیک ہے سب۔۔۔ دراصل مجھے خوشی کا اظہار کرنا نہیں آتا۔ میں عادی نہیں ہوں نا۔"

میں نے آہستگی سے کہا اور اسد مطمئن سا ہو گیا۔

"اوج بھابھی آکر خود ہی سارے احساسات جگا دیں گی۔"

وہ ہنسا اور بھابی نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

وہ تقریباً بارہ بجے تک یونہی ہنگامہ کرتے رہے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اپنا تجزیہ کیا۔ میرے اندر دور دور تک سناٹے پھیلتے تھے۔

چند دنوں بعد ہی ایک چھوٹی سی تقریب میں منگنی کی رسم ادا کی گئی اور ساتھ ہی شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ میں نے لیزا کو بتایا تو وہ از حد حیران ہوئی اور بار بار اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تم خوش ہو سکندر؟ کیا تمہیں یقین ہے کہ تم اوج کے ساتھ خوش رہو گے؟ میرا دل کہتا ہے تم خوش نہیں رہ سکو گے۔"

میں نے اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی محسوس کی لیکن نظر انداز کردیا۔

سرجان نے مجھے بہت خلوص سے مبارک باد دی اور میں دل ہی دل میں نادم سا ہو گیا۔ میں سرجان کی خواہش اور لیزا کے جذبوں سے نا آشنا تو نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے اپنا اندر ٹٹولنے کی کوشش کی۔

کیا میں لیزا سے محبت کرتا ہوں؟

لیکن اندر دور تک خاموشی تھی۔

شاید نہیں، وہ صرف میری دوست ہے۔

میں نے خود سے کہا۔ اوج بدستور میرے ساتھ کام کررہی تھی۔ آفس میں اور سائٹ پر میرا رویہ اس کے ساتھ بالکل نارمل تھا۔ اس نے بھی کچھ ظاہر نہیں کیا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی رشتہ قائم ہو چکا ہے۔ شادی سے پندرہ دن پہلے اس نے چھٹی لے لی تھی۔

میری طرف سے سب تیاری اسد اور اس کی بیوی نے کی تھی۔ سرجان اور لیزا میری شادی میں شرکت کے لیے نہ آسکے تھے البتہ سرجان نے ایک بڑی رقم کا چیک شادی کا گفٹ بھیجا تھا اور لیزا نے دل کی شکل کا لاکٹ جس کے مرکز میں ڈائمنڈ لگے تھے۔ میرے لیے اس دنیا میں سب سے زیادہ اپنے سرجان اور لیزا ہی تھے۔ وہ اس شادی میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ سو مجھے کسی اور کو انوائیٹ نہیں کرنا تھا۔ اسد اور بھابی نے ہی اپنے جاننے والوں کو بلا رکھا تھا۔

اوج میری دلہن بن کر میرے فلیٹ میں آگئی۔ اس روز اس نے میرون اور آف وائٹ ڈریس پہن رکھا تھا اور بے انتہا دلکش لگ رہی تھی۔ ایک لمحہ کو تو میں مبہوت سا رہ گیا۔

میں نے لیزا کا بھیجا ہوا لاکٹ ہی اسے رونمائی میں دیا تھا۔ دراصل مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا کہ مجھے خود بھی کچھ خریدنا ہے۔ یہ تو رخصتی کے کچھ دیر بعد اسد کی بیوی نے پوچھا کہ "بھائی اوج کی رونمائی کے لیے کیا خریدا ہے؟"

تو تب مجھے پتا چلا تھا کہ مجھے بھی خود کچھ خریدنا ہے۔ لیزا کا بھیجا ہوا لاکٹ میرے پاس ہی پڑا تھا جو ایک دن پہلے ہی مجھے ملا تھا۔ سو میں نے وہی اسد کی بیوی کو دکھایا۔

♥ ♡ ♡ ♥

زندگی کی ایک نئی روٹین شروع ہو گئی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ اوج اس شادی سے خوش تھی یا نہیں لیکن خود اپنے احساسات کا مجھے پتا نہیں چل رہا تھا۔ شادی بھی میرے لیے زندگی کے دوسرے کاموں کی طرح ایک کام تھی جسے میں نے منطقی انداز میں کرلیا تھا۔

چند ہی دنوں میں اوج نے گھر کا سارا انتظام سنبھال لیا تھا۔ وہ صبح سویرے اٹھ کر ناشتہ بناتی۔ میرے کپڑے استری کرکے مجھے تیار ہونے میں مدد دیتی۔ غرض اچھی بیویوں والے سارے کام وہ خاموشی سے کررہی تھی۔ ہم لوگ ہنی مون کے لیے باہر نہیں جاسکے تھے۔ اس وقت جب پراجیکٹ اپنے آخری مراحل میں تھا میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

پراجیکٹ کی تکمیل کے بعد ریلیکس ہو کر چلے جائیں گے۔ اوج نے بھی میری تائید کی تھی۔

یوں ہمارا ہنی مون پینڈنگ میں پڑ گیا تھا۔ اوج کی چھٹی ختم ہوئی تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا وہ اپنی جاب جاری رکھ سکتی ہے۔

وہ ایک ٹیلنٹڈ لڑکی تھی۔ بعض اوقات اس کے مشورے بڑے کار آمد ہوتے تھے۔ سو میں نے اسے جاب جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔

"تھینک یو سکندر!" میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں یکدم لو دے اٹھی تھیں۔ اور چہرا کھل اٹھا تھا۔

اس کی خوشی دیکھ کر پتا نہیں کیوں میرے اندر یہ کمینہ خیال پیدا ہوا کہ میں اسے جاب پر جانے سے منع کردوں اور پھر اس کی بے بسی دیکھوں۔ ظاہر ہے وہ میرے منع کرنے کے باوجود جاب پر جاسکتی تھی۔ اس کی بے بسی اور جھنجلاہٹ کے تصور سے ہی میرے اندر خوشی کے پھول سے کھلنے لگے۔ لیکن وہ مجھے اسسٹ کررہی تھی۔ اور سب کام کو بہتر سمجھتی تھی۔ میں پراجیکٹ کے اس انتہائی مرحلے پر کسی اور کو افورڈ نہیں کرسکتا تھا۔ سو میں نے اپنی خواہش پر قابو پالیا لیکن بہت دیر تک دل ہی دل میں اپنی اس خواہش پر حیران ہوتا رہا اور اوج کلکاتی ہوئی جانے کیا بتاتی رہی۔ وہ بہت خوش تھی اور مجھے اس کی خوشی بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

پتا نہیں کیوں ہماری شادی کو چند روز ہی ہوئے تھے اور آج پہلی بار میں نے اسے اتنا خوش دیکھا تھا۔

www.allurdu.com

"سکندر! آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی" حالانکہ آفس میں اور سائٹ پر آپ کا رویہ میرے ساتھ بہت سخت تھا؟" اس نے چائے کا کپ میرے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

لیکن اس سوال کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں تھا کہ میں نے اس سے شادی کیوں کی۔ یہ تو مجھے اب پتہ چلا ہے کہ میں نے اس سے شادی کیوں کی تھی۔ لیکن تب میں اپنے لاشعور کی کارستانی سے بے خبر تھا۔

"شاید اس لیے کہ میں تمہارے علاوہ کسی لڑکی کو نہیں جانتا تھا اس لیے میں نے بھائی کے سامنے تمہارا نام لے دیا۔"

میں نے محسوس کیا کہ میرے جواب نے اسے کچھ مایوس کیا ہے۔ شاید وہ یہ سننا چاہتی تھی کہ میں اس سے محبت کرنے لگا تھا اس لیے وہ اس قابل تھی کہ اس سے محبت ہو جائے لیکن مجھے شاید اس سے محبت نہ تھی تب اور نہ ہی میں نے اس لیے اس سے شادی کی تھی کہ مجھے اس سے محبت ہے۔

محبت تو میں نے اس سے اب کی تھی۔ اس کے جانے کے بعد اور یہ تو مجھے اب پتا چلا تھا کہ میں سکندر علوی اوج کمال سے کتنی شدید محبت کرتا ہوں۔

اتنی شدید کہ مجھے لگتا ہے میں اب اس کے بغیر جی نہ پاؤں گا۔

میں نے اپنا تجزیہ کیا ہے جب سے وہ گئی ہے تب سے میں ہر رات اپنا احتساب کرتا ہوں۔

مجھے اس کی خود اعتمادی اچھی نہیں لگتی تھی۔

میں اسے جھکانا چاہتا تھا۔ بے بس دیکھنا چاہتا تھا۔

مجھے اس سے کوئی دشمنی نہ تھی۔ اس نے میرا کچھ نہیں بگاڑا تھا بلکہ میرے گھر کو اور مجھے سنوارنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اس کی زندگی عذاب بنا دی تھی۔

وہ ساری نفرت، وہ سارا غصہ جو میرے اندر تھا۔ وہ میں نے اس پر انڈیل دیا۔

میں نجیب اللہ علوی، رقیہ علوی۔ اسمارہ علوی اور نجیب اللہ علوی سے اپنا بدلہ نہیں لے سکا تھا قدرت نے انصاف اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ سو وہ سارا غصہ، ساری نفرت میرے اندر ہی اندر بل کھاتی رہتی تھی۔ اور اس غصے کی آگ میرے وجود کو جلاتی رہتی تھی۔

میں غیر ارادی طور پر اوج پر اپنا غصہ اتارنے لگا۔

میں چاہتا تھا وہ روئے پیٹے چلائے اور میرے رویوں اور سلوک پر احتجاج کرے لیکن اس نے کبھی احتجاج نہیں کیا تھا۔ بس کبھی کبھار شکوہ بھری نظروں سے مجھے دیکھتی۔

میں اس کے احتجاج نہ کرنے پر اور بھی جھنجلاتا۔ میرا غصہ اور بھی سوا ہو جاتا اور میں اسے مزید اذیت دیتا۔ کئی دفعہ مجھے اپنے رویے پر افسوس بھی ہوتا اور میں سوچتا اوج سے سوری کر لوں اور آئندہ اس طرح نہ کرنے کا عہد کر لوں۔ لیکن پھر پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ جب وہ میرے سامنے ہوتی تو غیر ارادی طور پر میرا رویہ اس کے ساتھ سخت ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی اترتی اور پھر وہ نارمل ہو جاتی۔ اس نے ہر وہ کام کیا۔ جو میں نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں کبھی لو چہرے پر بے بسی دیکھ کر مجھے عجیب سکون سی خوشی ہوتی تھی۔ حالانکہ اس نے میرا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ ایک بار اس نے کہا تھا۔

"سکندر! میں تمہاری بیوی ہوں۔ تم مجھے اپنی مرضی اور چاہت سے بیاہ کر لائے ہو۔ پھر ایسا کیوں کرتے ہو۔ اگر تمہیں کوئی الجھن ہے تو مجھ سے شیئر کرو کوئی پرابلم ہے تو ہم دونوں مل کر حل کر لیتے ہیں۔ لیکن خدا کے لیے زندگی کو جہنم مت بناؤ اپنے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔"

لیکن میں نے زندگی کو جہنم بنا دیا تھا۔ اپنے لیے بھی اور اس کے لیے بھی۔ وہ اکثر اپنے ماضی اور بچپن کا ذکر کرتی تھی لیکن میں نے کبھی اپنے بچپن یا ماضی کا ذکر اس سے نہیں کیا تھا۔ میرا ماضی اور میرا بچپن خوشگوار نہ تھا۔ اگر کہیں کوئی خوشگوار بات تھی بھی تو ذرا کم ہو چکی تھی۔

مجھے صرف یہ یاد تھا کہ حمید اللہ کے مرنے کے بعد

www.allurdu.com

نجیب اللہ نے ہمیں گھر سے نکال دیا تھا اور ہم ایک گنجان محلے کے چھوٹے سے گھر میں رہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ میں یہ بھول چکا تھا کہ جب حمید اللہ علوی زندہ تھا تو اس نے میرے کتنے لاڈ اٹھائے تھے۔

جب اوج کہتی کہ ڈیڈی مجھے ہمیشہ ساتھ لے کر جاتے تھے کہیں بھی جانا ہوتا" انہوں نے میرے لیے دنیا جہان کے کھلونے اور گیمز خرید کر رکھے ہوئے تھے۔"

تو میری رگوں میں آگ دوڑنے لگتی۔

مجھے بالکل یاد نہیں تھا کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں ہی حمید اللہ نے میرے لیے ایک قیمتی چیز خریدی تھی۔

مجھے تو صرف اتنا پتا تھا کہ جب اسرار علوی ٹی وی پر لے اسٹیشن لگا کر ریموٹ ہاتھ میں پکڑتی تھی تو مجھے کمرے سے دیکھ کر وہاں سے بھگا دیتی۔ مجیب اللہ یا نجیب اللہ ہوتا تو ایک آدھ تھپڑ بھی لگا دیتا۔ مجھے یہ یاد نہیں تھا کہ افزا علوی مجھ سے کتنی محبت کرتی تھی ہاں میرے اندر یہ دکھ زندہ تھا کہ افزا علوی مجھے تن تنہا دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود مزے سے ہمیشہ کی نیند سو گئی تھی۔ اور اس کے بعد میرے لیے کیا رہ گیا تھا۔

صرف گالیاں

دھکے، تھپڑ اور لاتیں۔

جب اوج اپنے بھائی کا ذکر کرتی جو اس کا سگا بھائی نہ تھا تو اس کی محبت کی چمک اس کی آنکھوں سے چھوٹتی اور لفظوں سے ظاہر ہوتی تو مجھے اپنا ماجد خان یاد آجاتا جو میرا سگا بھائی تھا لیکن جو زندہ نہیں تھا میں اس کی محبتوں کو انجوائے نہیں کر سکتا تھا جب کہ وہ اس بھائی کی محبتیں انجوائے کر رہی تھی جو اس کا سگا بھائی بھی نہ تھا۔

میں بھول گیا تھا کہ اسی دنیا میں نرس آنٹی، سرجان اور لیزا بھی تھے۔ جن کی محبتیں اور شفقتیں میرے لیے تھیں۔ بہت سارے لوگ اس دنیا میں تنہا رہ جاتے ہیں۔ بے یارومددگار اور کوئی ان کا ہاتھ تھامنے والا نہیں ہوتا اور وہ اس دنیا کے اندھیروں میں کھو جاتے ہیں۔ جب کہ میں تو خوش قسمت تھا کہ مجھے نرس آنٹی مل گئی تھیں۔ سرجان مل گئے تھے اور لیزا مل گئی تھی۔ لیکن میں نے خود کو بھی خوش قسمت نہ جانا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ میں زیادہ ایگریسو ہوتا جا رہا تھا۔

میں نے اوج کی جاب چھڑوا دی۔

اس نے کوئی احتجاج ہی نہ کیا۔ حالانکہ سعد خان اور اسد نے بہت کہا کہ مجھے اس کا ٹیلنٹ ضائع نہیں کرنا چاہیے لیکن میں نے کہا۔

"وہ میری بیوی ہے اور ایک بیوی کے لیے بہترین مقام اس کا گھر ہے۔ آپ نے اس کی صلاحیتوں سے بہت فائدہ اٹھا لیا اب کسی اور کو موقع دیجیے دنیا میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں ہے۔"

میرا لہجہ گستاخانہ تھا لیکن سعد خان نے مسکرا کر نظر انداز کر دیا۔

"او کے۔ جنٹلمین۔"

میں نے اسے گھر تک محدود کر دیا۔ اسے میکے جانے سے روک دیا۔

"مجھے تمہارا روز روز میکے جانا پسند نہیں ہے۔"

حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ چند دو تین دن کے بعد ہی میکے جاتی ہے۔ ایک ہی شہر میں رہ کر جب وہ مہینوں میکے نہ جا پاتی تو میں اس کی بے بسی اور جھنجلاہٹ سے لطف اٹھاتا۔ اس کی آنکھوں کی نمی مجھے محظوظ کرتی اور پھر کبھی کبھی از راہِ کرم میں اسے تیار ہونے کو کہہ دیتا۔ تو وہ کھل اٹھتی۔ اور منٹوں میں تیار ہو جاتی تب مجھے یاد آتا کہ مجھے تو ایک ضروری کام سے جانا تھا۔ خیر کل چلیں گے۔"

اس کی آنکھوں کی روشنیاں بجھ جاتیں۔ اور میرا جی چاہتا میں رقص کے انداز میں دونوں ہاتھ پھیلائے گول گول گھوم جاؤں۔

اور پھر میں اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دزدیدہ نظروں سے دیکھتا۔ بے بسی سے ہونٹ کاٹتی ہوئی اوج کمال کو دیکھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آجاتا۔ جب مجھے پیپر کی تیاری کرنا ہوتی اور غلطی سے نجیب اللہ کو پتا چل جاتا اس رات وہ بہانے سے مجھے رات گئے تک الجھائے رکھتا۔ سارے کام ختم ہو جاتے تو سر پالش کرنے کو کہہ دیتا۔ وارڈ روب سے کپڑے نکال کر باہر پھینک دیتا۔ سارے جوتے نکال کر پالش کرنے کا حکم دیتا اور میں یونہی بے بسی سے ہونٹ کاٹتا کام کرتا رہتا۔ اور وہ میری اس کیفیت سے یوں ہی محظوظ ہوتا جیسے۔ میں اوج کو دیکھ کر محظوظ ہوتا تھا اب گیند میرے کورٹ میں تھی لیکن مقابل نجیب اللہ نہیں اوج تھی لیکن شاید میں نے اسے نجیب اللہ ہی سمجھ لیا تھا۔ کبھی کبھار میں اسے انتظار کرنے کا کہہ کر چلا جاتا وہ تیار ہو کر انتظار کرتی رہ جاتی اور میں گھر آنا بھول جاتا۔

"سوری اوج! میں ذرا اسد کی طرف چلا گیا تھا اور وہاں یاد ہی نہیں رہا کہ ہمیں انکل کی طرف جانا ہے۔ چلو کل چلیں گے۔"

میں بڑے اطمینان سے جواز دے کر پُرسکون سا ہو جاتا اور وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹتی رہ جاتی۔ وہ جتنا کمزور پڑتی" بے بسی دکھتی" میں اتنا ہی جابر ہوتا جاتا تھا۔ اور پھر میں نے حد ہی کر دی۔

بلال آسٹریلیا سے آیا ہوا تھا۔ وہ ایک بہت اچھی نیچر کا خوش مزاج لڑکا تھا۔ اوج کے ساتھ اس کی بہت دوستی تھی۔ اوج اور میں دو تین بار ہی اس سے ملنے گئے تھے" وہ بھی، جس روز وہ آیا تھا اور دوبارہ دعوت پر لیکن وہ ہر روز ہی آ دھمکتا تھا۔ اور پھر گھنٹوں بیٹھا اوج سے باتیں کرتا رہتا۔ اوج اس کی باتوں پر ہنستی رہتی مسکراتی رہتی۔ اس کی پسندیدہ ڈشیں بناتی اور میں کڑھتا رہتا۔

بلال کی اپنی سگی بہن کوئی نہیں تھی۔ وہ چھ بھائی تھے" بلال کا نمبر چوتھا تھا اور اسے اوج کی ماں نے گود لیا تھا۔ اور اوج پر وہ جان چھڑکتا تھا۔ میں یہ سب جانتا تھا مجھے یہ بھی پتا تھا کہ اوج کے باقی بہن بھائی ماموں زاد بھی اس پر جان چھڑکتے ہیں۔ اس کے ماموں ممانی اس کے چچا" اس کی چچیاں" اس کے کزن سب ہی ایک دوسرے سے بہت محبت رکھتے تھے اس کے باوجود میں بلال کے جانے کے بعد اس پر طنز کرتا۔

"یہ انوکھی محبت ہے۔ بھئی ماموں زاد کی ہم نے تو کبھی ایسی محبت نہیں دیکھی۔ صبح سے شام تک دھرنا مار کر بیٹھے رہتے ہیں صاحبزادے۔"

"وہ میرا ماموں زاد نہیں بھائی بھی ہے۔"

وہ مجھے بتاتی میں طنزیہ انداز میں کندھے اچکاتا۔

"تمہاری فیملی میں بہت محبت ہے" ایک دوسرے سے" ابھی آپ میرے دوسرے کزنز سے نہیں ملے نا۔"

وہ نرمی سے کہتی اور میرے اندر کوئی چٹکی لیتا۔ میں کتنا اکیلا تھا اور اس سے اتنے لوگ تھے محبت کرنے والے۔

"بس مجھے پسند نہیں ہے اس کا زیادہ یہاں آنا۔ منع کرو۔ آفس سے تھکا ہارا آؤں اور آگے یہ ہاہا ہو ہو مچی ہوتی ہے۔"

وہ ہونٹ کاٹ کر رہ جاتی اور آنکھوں کی نمی چھپانے کے لیے ادھر ادھر ہو جاتی۔ اور اس کی یہ بے بسی اور آنکھوں کی نمی میرے اندر چٹکی لیتے درد کے لیے مرہم بن جاتی میں اپنی بات کہہ کر بڑے سکون سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتا یا پھر کوئی میگزین یا اخبار لے کر اپنے بیڈ روم میں گھس جاتا۔

کئی بار میں نے محسوس کیا تھا۔ وہ رو کر آتی ہے۔ شاید کچن میں کام کرتے ہوئے یا پھر واش روم میں جا کر۔ وہ خاموشی سے کھانا تیار کر کے ٹیبل پر لگاتی اور پھر مجھے بلاتی اور نارمل طریقے سے کھانا پیش کرتی۔

"یہ لیں نا سکندر! یہ کوفتے بہت مزے کے ہیں' میں نے اپنی دادی اماں سے بنانے سیکھے تھے۔"

وہ کوفتے واقعی بہت مزے کے بناتی تھی بالکل افزا علوی کی طرح۔

اور اس طرح کے جملے وقتاً فوقتاً اس کے منہ سے نکلتے رہتے۔ کبھی کبھار میں حیران ہوتا کہ یہ کس مٹی کی بنی ہے۔ نہ مجھ سے لڑتی ہے نہ احتجاج کرتی ہے۔ میرا ہر ظلم خاموشی سے برداشت کر لیتی ہے۔

"کیا۔ کیا۔ اوج کمال مجھ سے محبت کرتی

www.allurdu.com

ہے؟"

میں سوچتا اور پشیمان ہو جاتا اور اپنے رویے کی تلافی کے لیے اسے باہر لے جاتا۔ آئس کریم کھلاتا۔ کپڑے خرید کر دیتا۔ آفس کے معاملات اس سے شیئر کرتا۔ لیکن پھر وہی وحشت عود کر آتی۔

اور مجھے یاد ہے رہتا کہ میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ اب اسے زچ نہ کروں گا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس دن آفس سے آیا تو بلال اور روحی وی۔ لاؤنج میں بیٹھے چلغوزے کھاتے ہوئے نہ جانے کس بات پر زور زور سے ہنس رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بلال نے سرگوشی میں کچھ کہا تھا۔ اور پھر ایک آنکھ بند کرتے ہوئے مسکرا دیا تھا اور ہمیشہ کی سی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

"او کے سکندر بھائی! میں چلتا ہوں' شام کو آپ لوگ ادھر آ رہے گا۔ میں نے لوح کو بتا دیا ہے سب کچھ۔"

"ارے یہ کیا۔۔۔ میں آیا ہوں اور تم چل دیے۔" میں نے مصنوعی خوش اخلاقی سے کہا۔

"نہیں بھائی! ضروری کام ہے۔"

وہ ہاتھ سے دکھڑی کا نشان بنا کر لوح کو دکھاتا تیز تیز قدموں سے باہر چلا گیا۔ اور خون میری کنپٹیوں پر ٹھوکریں مار رہا تھا۔ میں نے ہاتھ میں پکڑا بریف کیس اچھال کر پھینکا جو اس کے گھٹنے پر لگا اور اس نے سہم کر مجھے دیکھا۔

میرا موڈ بہت خراب تھا۔ آج آفس میں بلا وجہ ہی مسٹر ڈی سوزا سے بچ بچ ہو گئی تھی یہ سینئر انجینئر تھا اور چند ماہ قبل ہی نیویارک سے آیا تھا نسلاً برٹش تھا اور اپنی ذہنیت کے مطابق آج بھی ہمیں غلام سمجھتا تھا۔ اس کا انداز پاکستانی انجینئرز سے باتیں کرتے ہوئے انتہائی حقارت کا ہوتا تھا۔ اور اپنی غلامانہ ذہنیت کی بنا پر بعض کولیگز کو اس کے سامنے یس سر یس سر کرتے دیکھ کر میرے وجود میں آگ لگ جاتی تھی۔ اسے براہ راست ہیڈ آفس سے بھیجا گیا تھا اور وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا تھا اس روز اس نے ایک جونیئر انجینئر کو اس کی معمولی سی غلطی پر گالی دے دی۔ میں سائیٹ پر موجود تھا میں نے ایک مکا اس کے جبڑے پر لگایا۔

"اسے کسی ماتحت کو گالی مت دینا۔"

جواباً "اس نے ایک اور گالی اگل دی جو میرے لیے تھی پھر تو میرا دماغ الٹ گیا۔ فوراً "ہی لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا ورنہ وہ ہاسپٹل میں پڑا ہوتا۔ اب بھی اس کا منہ سوج گیا تھا اور ہونٹ کٹ گیا تھا۔ سعد خان یقیناً" میری یہ غلطی معاف نہیں کرے گا۔ میں جانتا تھا اس لیے میں سائیٹ سے سیدھا گھر آ گیا تھا اور یہاں لوح کو خوش دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔

"اچھا تو میری عدم موجودگی میں یہ گل چھرے اڑائے جاتے ہیں۔" لوح کا رنگ یکدم زرد پڑ گیا۔

"سکندر۔۔۔!"

"تمہیں امید تو نہیں ہو گی کہ میں اس طرح اچانک گھر آ جاؤں گا۔ اور تمہارا وہ نام نہاد بھائی مجھے دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔"

"سکندر۔۔۔!" اس کی آواز گھٹ گئی اور پورا وجود کانپنے لگا۔ "تم۔۔۔ سکندر تم نفسیاتی مریض ہو۔ لعنت پسند ہو تم۔۔۔ تم۔۔۔"

یکدم اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا اور تقریباً "بھاگتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ میں وہاں ہی تھکا تھکا سا صوفے پر گر پڑا۔ اور دل ہی دل میں ڈی سوزا کو گالی دی۔

"ابھی تک ہمیں غلام سمجھتے ہو۔"

اور ریلیکس ہونے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر یونہی آنکھیں بند کیے پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا پھر آہٹ پر آنکھیں کھول دیں۔ لوح بیگ اٹھائے کمرے سے نکل رہی تھی۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"میں جا رہی ہوں۔"

"کہاں۔۔۔؟"

"اپنے گھر' اپنے والدین کے گھر ہمیشہ کے لیے۔

اس بیگ میں صرف چند جوڑے کپڑے ہیں۔ آپ کی کوئی چیز ساتھ لے کر نہیں جا رہی۔"

وہ جاتے جاتے مڑی اور گلے سے لیزا والا لاکٹ اتار کر ٹیبل پر رکھ دیا۔ اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔ اور میں وہیں بیٹھا سوچتا رہا کہ آخر آج ایسی کیا انہونی بات ہو گئی ہے کہ وہ خفا ہو کر جا رہی ہے۔ یقیناً" خفا ہو کر ہی گئی ہے۔ ورنہ لاکٹ بھی نہ دے کر جاتی۔ میں نے ٹیبل سے لاکٹ اٹھا کر مٹھی میں بند کر لیا جو اس کے وجود کی حدت سے ابھی تک گرم تھا" میں تو اس سے بھی زیادہ اسے ڈانٹا ڈپٹتا رہتا ہوں لیکن آج۔۔۔ خیر خود ہی چند روز تک آ جائے گی۔ میں نے لاکٹ دراز میں ڈال دیا۔ اور خود اسد کی طرف چلا گیا۔

میں نے واقعی بلال کے حوالے سے بہت گری ہوئی بات کی تھی۔ مجھے اس طرح کی بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ لیکن بعد از حقیقت میں یہ مطلب ہرگز نہ تھا۔ میں نے تو یونہی اپنا غصہ فرو کیا تھا۔ بے سوچے سمجھے بک گیا۔

مجھے اس کے کردار پر کبھی شبہ نہیں ہوا تھا اس کا کردار میرے سامنے تھا اس نے میرے ساتھ اتنا عرصہ کام کیا تھا اور فرقہ ورانہ کار کن اس کی عزت کرتا تھا" میں جانتا تھا اس نے اور بلال نے ایک ہی گھر میں بہن بھائیوں کی طرح پرورش پائی ہے۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو بھلا کیا رکاوٹ تھی۔ میں نے سب کچھ بلا ارادہ کیا تھا۔ مجھے عادت ہو گئی تھی اسے زچ کرنے کی ورنہ آج ڈی سوزا کے ساتھ جھگڑے کی وجہ سے میں اس کے رونے اور آنسوؤں کو بھی اگنور نہیں کر سکتا تھا۔

سب کچھ بلا ارادہ ہوا تھا لیکن اب وہ جا چکی تھی رات گئے جب میں اسد کے گھر سے آیا تو گھر کا سناٹا دیکھ کر کوفت ہوئی۔ گھر کے اندر بھی سناٹا تھا۔ میں خاموشی سے جا کر بیڈ روم میں لیٹ گیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد میرا دل گھبرانے لگا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رات گئے تک اس کی موجودگی کا احساس ہوتا رہتا تھا اسے زیورات سے دلچسپی نہ تھی ویسے سے اگلے روز ہی اس نے سارے زیور اتار کر لاکر میں رکھوا دیے تھے بس ایک لاکٹ جو میں نے رونمائی میں دیا تھا اور ایک انگوٹھی پہنے رکھتی تھی۔ لیکن اسے کانچ کی چوڑیوں کا شوق تھا۔ رنگ برنگی چوڑیاں کلائی میں سجائے رکھتی۔ اور ادھر ادھر جاتے ہوئے اس کی چوڑیوں کی کھنک مجھے اچھی لگتی تھی۔ میں نے اس جلترنگ کو سننے کی شدید خواہش اپنے دل میں محسوس کی۔ اور بیڈ روم سے اٹھ کر ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھا۔ لیکن یہ جلترنگ کہیں سنائی نہ دے رہا تھا۔

میں نے اٹھ کر اپنے لیے چائے تیار کی۔ وہ کچن کا سارا کام خود ہی کرتی تھی۔ حالانکہ میں نے کئی بار کہا بھی تھا کہ کسی کو ملازم رکھ لے۔ لیکن اس نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ بس صفائی کے لئے صبح صبح ایک عورت آتی تھی۔

چائے کا کپ لے کر میں اپنے بیڈ روم میں گیا تو کسی اندرونی جذبے سے بے قرار ہو کر میں نے اس کے گھر کا نمبر ملایا' دوسری طرف اس نے خود ہی اٹھایا تھا۔ اور میری آواز سن کر ریسیور رکھ دیا۔ وہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ حالانکہ میں اس سے معذرت کرنا چاہتا تھا' اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں غصے میں تھا اور یوں غصے میں الٹا سیدھا بک گیا تھا۔ مگر وہ تو بات ہی نہیں کر رہی تھی۔

اگلے دو ہفتے میں مسلسل اسے رنگ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ جو بھی ریسیور اٹھاتا۔ شائستگی سے کہہ دیتا۔ "لوح آپ سے بات نہیں کرنا چاہتی۔"

اس دوران اسد اور بھائی کو بھی اس ناراضی کا پتا چل چکا تھا اور اپنے طور پر دونوں کوشش کر چکے تھے میری توقع کے برعکس سعد خان نے مجھے جاب سے نکالنے کے بجائے میرا ٹرانسفر کراچی آفس میں کر دیا تھا۔ میں وہاں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن سعد خان کے سامنے انکار نہ کر سکا۔ اس نے جس طرح ڈی سوزا والے معاملے پر مجھے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا اس نے مجھے اندر ہی اندر شرمندہ کر دیا تھا۔

"یہ ٹرانسفر عارضی ہے صرف چند ماہ کے لیے۔"

اس نے مجھے متذبذب دیکھ کر کہا۔ اور میرا اندھا

www.allurdu.com

ٹھیک کر چلا گیا۔

♥ ▽ ▽ ♥

اس روز میں آفس سے نکلا تو گھر جانے کے بجائے اوج کی طرف چل پڑا۔ فون پر بات نہیں سنی تھی لیکن جب میں اس کے سامنے جا کر کھڑا ہوں گا ہاتھ جوڑ دوں گا تو وہ ضرور سن جائے گی۔ مجھے یقین تھا۔ اور جب میں اسے بتاؤں گا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ بہت شدید محبت لیکن اس کا انکشاف مجھ پر اب ہو رہا ہے تو اس کی آنکھیں لو دے اٹھیں گی۔ رخساروں پر شفق اتر آئے گی۔

ہاں مجھ پر ان دو دنوں میں انکشاف ہوا تھا کہ میں نے اوج کمال سے اس لیے شادی کی کہ میں اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ سچ کہتی ہے کہ مجھے اپنے آپ کو کھوجنا چاہیے۔ میں نے اپنے آپ کو کھوجا ہے۔ اور مجھے پتا چلا ہے کہ میرے اندر کتنے نفسیاتی مسئلے ہیں جنہیں حل کرنا ہے۔

میں اسے بتاؤں گا کہ میں نے ڈاکٹر صدیقی کو جوائن کیا ہے اور میں تین دن سے مسلسل ان کے ساتھ میٹنگ کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے میں بہت جلد اپنی خامیوں پر قابو پا لوں گا۔ ڈاکٹر صدیقی کہتے ہیں مجھ میں بہت ول پاور ہے۔

"آئی لو یو اوج، آئی لو یو۔"

میں نے دل میں کتنی بار زیر لب کہا۔ میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا حالانکہ میں جھکنے جا رہا تھا لیکن میری غلطی تھی۔ اور اس جھکنے میں بہت لطف تھا۔ مگر گیٹ پر بڑا سا تالا میرا منہ چڑا رہا تھا۔ واپسی کا سفر بہت تھکا دینے والا تھا۔ اسد کے گھر سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ لوگ ہلال کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد گئے ہوئے ہیں۔

ہلال کے حقیقی والدین فیصل آباد میں ہی رہائش پذیر تھے۔ اسد کے گھر سے رات کا کھانا کھا کر میں واپس گھر آیا تو بہت اداس تھا۔ پھر بھی پر امید تھا کہ کراچی جا کر چند دن بعد ایک دو روز کے لیے لوٹوں گا اور اوج کو مناؤں گا۔ لیکن کراچی پہنچنے کے دو تین دن بعد ہی سعد خان نے فوراً ابوظہبی آفس پہنچنے کے لیے کہا۔

"بہت بڑا پروجیکٹ ہے سکندر اور صرف یہ کہ یہ پروجیکٹ لینا ہے بلکہ اس پروجیکٹ کو تم ہی ہینڈل کرو گے۔ دو تین روز میں تمہارا ویزا اور ٹکٹ پہنچ جائے گا۔"

جانے سے پہلے میں نے چاہا کہ اوج سے بات ہو جائے لیکن وہاں سے کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا پھر ابوظہبی سے بھی کئی بار میں نے ٹرائی کیا۔ بس بیل ہوتی تھی لیکن کوئی ریسیو نہیں کرتا تھا یا تو انہوں نے وہ گھر چھوڑ دیا تھا یا پھر نمبر تبدیل کیا تھا۔ تنگ آ کر میں نے رنگ کرنا چھوڑ دیا۔ البتہ اسد سے میں نے رابطہ رکھا ہوا تھا۔ اسد نے ہی مجھے بتایا کہ وہ اسی گھر میں ہیں البتہ کافی دن فیصل آباد رہے۔

میں نے سوچا ایک دفعہ پروجیکٹ کا کام شروع ہو جائے تو تین چار دن کی چھٹی لے کر جاؤں گا اور اوج کو مناؤں گا۔ لیکن اگر وہ سن گئی میرے ساتھ آ گئی تو کیا میں پھر اس کے ساتھ ویسا ہی نہیں کروں گا جیسا پہلے کرتا تھا۔

اس نے کہا تھا میں نفسیاتی مریض ہوں۔

مجھے ڈاکٹر صدیقی سے اینالائزنگ مکمل کرانی چاہیے۔ مجھے اپنے اندر موجود گرہیں کھولنی چاہئیں تب مجھے جانا چاہیے اوج کے پاس۔

جب کامیابیاں حاصل کرنے والے لوگ مجھے برے نہ لگیں۔

جب اوج کی لااعتنائی پر مجھے فخر محسوس ہو۔

جب بے بس اور مجبور لوگوں کو دیکھ کر مجھے تسکین نہ ہو۔

ہاں میں اپنا علاج کرواؤں گا اس لیے کہ میں اوج کے بغیر نہیں رہ سکتا میں جانتا ہوں میں نے جان لیا ہے۔

پروجیکٹ مکمل ہوتے ہی میں پہلے ڈاکٹر صدیقی کے پاس جاؤں گا اور پھر اوج کے پاس۔ میں نے فیصلہ کر لیا۔

www.allurdu.com

ایک دن اسد نے مجھے بتایا کہ اوج نے کتنی ہی بار فون کر کے اس سے میرے متعلق پوچھا ہے۔

"یار! بھائی کا غصہ اتر گیا ہے۔ لیکن بات کیا ہوئی تھی۔ بھائی تو اس طرح غصے سے گھر چھوڑ کر آنے والی نہیں تھیں۔"

اسد نے پوچھا تھا تب میں نے مختصراً "اسد ملک کو اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ اسد کو پہلے بھی اندازہ تھا" کچھ وہ جانتا تھا کہ میں وہاں ہالینڈ میں بھی کبھی کبھی کتنا ایگریسو ہو جاتا تھا ایک بار تو میں نے لیزا کو غصے میں دھکا دے دیا تھا اور وہ سیڑھیوں سے گر پڑی تھی۔ حالانکہ وہ سرجان کی بیٹی تھی۔ جو میرے محسن تھے۔

"لیکن دوست! ساری زندگی تو اس طرح نہیں گزر سکتی اپنے آپ کو بدلو۔"

"بدلنا چاہتا ہوں اسد! میں سمجھتا ہوں کہ مجھے کسی نفسیاتی معالج کی ضرورت ہے اور میں اسی وقت اوج کے پاس جانا چاہتا ہوں' جب میں اپنی ذات کے اس حصار کو توڑ دوں گا جو مجھے مکمل طور پر خوش نہیں ہونے دیتا۔"

اور میں نے اسد ملک سے درخواست کی کہ وہ اوج کو میرے متعلق نہ بتائے اور یہ اسد ملک ہی تھا جس کی وجہ سے اوج کو آفس سے بھی میرے متعلق صحیح معلومات نہیں مل سکیں۔ اور میں جلدی جلدی اپنا پروجیکٹ مکمل کرنے کی کوشش میں لگا ہوں' دن رات تاکہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے واپس جا کر اپنا علاج کروا سکوں' اور ماضی کی ساری تلخیوں کو بھلا کر سارے حصار توڑ کر اوج سے ملوں۔

♥ ♡ ♡ ♥

اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بے قصور ہوتے ہوئے بھی خود کو قصوروار سمجھنے لگتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے میں خود کو قصوروار سمجھ رہا ہوں۔ حالانکہ میرا کوئی قصور نہیں۔ لیکن جب سکندر علوی نے میرے ایک سوال کے جواب میں نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا تھا اور اس کے ہونٹ زہر میں بھیگ گئے تھے۔

"میری والدہ کے قریبی عزیزوں نے ان کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی جو نہ صرف پہلے سے شادی شدہ تھا بلکہ تین بچوں کا باپ بھی تھا۔ اگر وہ ان کی اپنی سگی بیٹی ہوتی تو وہ ایسا ہرگز نہ کرتے۔ حالانکہ افزا علوی ان کی بہت تعریف کرتی تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے میری ماں کے ساتھ ظلم کیا اگر وہ یہ ظلم نہ کرتے تو میرے ساتھ وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا تھا۔"

"افزا علوی" کے نام نے مجھے چونکا دیا۔ میرا دل ایک لمحہ کو جیسے کہیں پاتال میں گر گیا افزا۔۔۔ یہ نام آج جب کہ میں صبا کے ساتھ ایک مکمل اور بھرپور زندگی گزار رہا تھا میری ایک بیٹی تھی اوج کمال

میری محرومیوں کا حاصل
میری حیات کی روشنی
میرے زندہ رہنے کا جواز

اور یہ سکندر علوی اسی اوج کمال کا پروپوزل لے کر آیا تھا۔ مجھے یہ نوجوان اچھا لگا تھا اس کی شخصیت اور ذہانت نے مجھے متاثر کیا تھا۔ یہ ہر لحاظ سے اوج کے قابل تھا۔ اوج بھی تو کچھ کم ذہین نہیں تھی۔ لیکن اس نے افزا علوی کے ان عزیزوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے نفرت کی جو آگ نکل رہی تھی اس نے ایک لمحہ کے لیے مجھے اندر تک ہلا دیا۔

"تمہارے والد کا نام بیٹا؟" مجھے خود اپنی آواز میں کپکپی سی محسوس ہوئی۔

"سعید اللہ علوی۔" اس کی آنکھوں میں ابھی بھی وہی تنفر تھا اور مجھے لگا جیسے میں اندر تک جل اٹھا ہوں راکھ ہو گیا ہوں۔ میرا دل چاہا اس سے کہوں۔

"بیٹا! اپنی نگاہیں جھکا لو' تمہاری آنکھوں کی یہ نفرت مجھے بھسم کیے دے رہی ہے۔"

لیکن میرے لب سل گئے تھے' اور حلق میں جیسے کانٹے اگ آئے تھے میں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس کی طرف دیکھا۔ تو اس نے نظریں جھکا لی تھیں۔ اور چہرے پر وہی پہلے کا سا تاثر ابھر رہا تھا۔

وہی تاثر جس میں ایک حزن تھا۔

ملال تھا۔

اور عجیب طرح کی ملاحت تھی۔

اور یہی تاثر پہلی بار میں نے افزا کے چہرے پر دیکھا تھا جب وہ بابا اور اماں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ہمارے گھر رہنے آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ملال کے رنگ تھے اور چہرے پر ایک حزن کی سی کیفیت تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی بار میں نے افزا کو اس کے گھر میں دیکھا تھا تو وہ مجھے ایک معصوم سی بچی لگتی تھی اپنے بابا کے کام دوڑ دوڑ کر کرتی ہوئی۔ لیکن اس روز جب بابا نے مجھے بتایا کہ افزا کو وہ اپنے ساتھ لے آئے ہیں ہمیشہ کے لیے تو اس کی آنکھوں کی سیاہیوں میں یکدم پانی پھیلتا چلا گیا تھا اور وہ ہونٹ کاٹتی ہوئی ضبط کی انتہائی حدوں سے گزر رہی تھی۔ میں کتنی ہی دیر تک اس کے چہرے سے نگاہیں نہیں ہٹا سکا تھا۔

اس کے آنے سے گھر میں بہت تبدیلی آگئی تھی۔ جہاں اماں کی برسوں پرانی بیٹی کی خواہش پوری ہوئی تھی وہاں جمال اور نمال کے عیش ہو گئے تھے انہیں اپنے کپڑے استری کیے کرائے مل جاتے تھے۔

جوتوں پر پالش کی ہوتی۔ بہت سارے کام جو اماں اکیلا ہونے کی بنا پر وقت پر نہ کر پاتی تھیں' افزا کے آنے سے وقت پر ہونے لگے تھے۔

گیلے تولیے اور کپڑے جو صوفوں پر پڑے رہتے تھے' اپنی صحیح جگہ پر ملنے لگے تھے گھر کے اندر یہ تبدیلی بہت خوش کن تھی۔ لیکن جو تبدیلی میرے اندر ہوئی تھی وہ بہت خوبصورت اور دلکش تھی میرا دل ایک انوکھے جذبے سے روشناس ہوا تھا اور ایک نئی لَے پر دھڑک رہا تھا۔ میں جب رات کو بستر پر لیٹتا تو میری آنکھوں کے سامنے اس کا سراپا آ جاتا۔

اماں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہوئے

نمال سے جھگڑتے' جمال سے گپ لگاتے ہوئے

اور بابا کے آفس سے آنے کے بعد بھاگ بھاگ کر ان کے کام کرتے

کبھی چائے لا رہی ہے' کبھی ان کے کپڑے اور کبھی ان کے پاؤں دبا رہی ہے۔ وہ منع کرتے رہتے لیکن وہ دباتی رہتی۔

"بابا! آپ تھک گئے ہوں گے۔"

بہت جلد وہ اس گھر میں اس طرح رچ بس گئی تھی جیسے ہمیشہ سے یہاں ہی رہتی آ رہی ہو اور خود مجھے تو یوں لگتا تھا جیسے وہ ازل سے میری رگوں میں زندگی بن کر دوڑ رہی ہے۔

نمال کی پیاری بجو' جمال کی بہن ہی نہیں دوست بھی' اماں اور ابا کی پیاری بیٹی۔

اور میرے لیے وہ کیا تھی' مجھے خود خبر نہ تھی۔ میں کالج سے آتا اور وہ نظر نہ آتی تو میں بے چین ہو جاتا جب تک وہ دکھائی نہ دیتی مضطرب رہتا۔

زندگی کے رنگ ہی بدل گئے تھے۔ عام دنوں کے علاوہ یوں لگتا تھا جیسے تہوار بھی حسین ہو گئے ہوں۔

افزا کی تیاریاں' اسے چاند رات میں شاپنگ کے لیے لے کر جانا اس کے لیے چوڑیاں خریدنا۔

نمال اور جمال اس میں بہت پیش پیش ہوتے' میرے ساتھ وہ بہت بے تکلف نہ تھی۔ لیکن یہ بھی نہیں تھا کہ ہمارے درمیان کوئی تکلف ہو۔ یا اجنبیت ہو۔ بس خود بخود ہی وہ جذبہ۔ جس نے میرے دل و جان کو روشن کر رکھا تھا۔ مجھے اس سے اس طرح بے تکلف نہ ہونے دیتا جس طرح نمال اور جمال تھے۔ حالانکہ وہ میرے کپڑوں' جوتوں اور دوسری ضروریات کا اسی طرح خیال رکھتی تھی۔ جس طرح نمال اور جمال کا۔

صبح صبح جب میں نمال اور جمال کو ان کے کالج ڈراپ کر کے اسے اس کے کالج ڈراپ کرتا تو وہ مسلسل بولتی رہتی۔ نمال کی شرارتیں۔

جمال کی بونگیاں' کالج کی سہیلیوں کی باتیں اور میرا جی چاہتا سفر لمبا ہو جائے اور میں تمام عمر اس کی دلکش آواز سنتا رہوں۔ لیکن اس کا کالج آ جاتا اور وہ کالج پر اترتے ہوئے ہنس دیتی۔

"سوری کمال بھائی! میں نے آپ کو بور کیا۔ آپ تو اتنے کم گو ہیں' لفظ بھی سوچ سوچ کر بولتے ہیں اور میں اتنی باتونی ہوں' بکتی رہتی ہوں' آپ بور ہوئے؟"

www.allurdu.com

"نہیں بالکل نہیں، مجھے تمہارا بولنا اور تمہیں سننا بہت اچھا لگتا ہے۔"

اور اس کی آنکھیں جگمگ جگمگ کرنے لگتیں۔

"سچ بھائی۔"

اس کی آنکھیں بہت روشن اور چمک دار تھیں بالکل سکندر کی آنکھوں کی طرح۔ سکندر کی آنکھیں بالکل افرا جیسی ہیں اور اس کے ہونٹوں کی بناوٹ بھی اور اس کے بات کرنے کا انداز بھی بالکل افرا جیسا ہے۔ ٹھہرا ٹھہرا اور دھیما دھیما سا۔ شاید تب ہی وہ مجھے اتنا اپنا اپنا لگا تھا۔ اور پہلی نظر دیکھتے ہی اور اس سے بات کرتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لڑکا اوج کے لیے بہت موزوں ہے۔

میں نے افرا سے بہت محبت کی بے حد شدید لیکن افرا ہمیشہ ان شدتوں سے بے خبر رہی۔ میں کبھی اپنے جذبوں کا اظہار نہ کر سکا۔ میں نے سوچا تھا ابھی وہ بہت معصوم ہے جب وقت آئے گا تو میں تب ہی اپنے جذبوں کا اظہار کروں گا۔ ان دنوں میں اپنا گریجویشن مکمل کر چکا تھا اور میں نے ایم۔ ایس۔ سی میں ایڈمیشن کے لیے باہر یونیورسٹی میں اپلائی کیا ہوا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے دل میں محبتوں کے چراغ جلا کر خود دو تین سال کے لیے غائب ہو جاؤں۔ وہاں واپس آ کر اماں اور بابا سے بات کر کے میں پورے استحقاق کے ساتھ اپنے جذبے اس پر ظاہر کروں گا۔ لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان جو سوچتا ہے وہ ہوتا نہیں ہے اور جو نہیں سوچتا وہ ہو جاتا ہے۔

میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میرے سارے خواب تعبیر پانے سے پہلے ہی میری آنکھوں میں مر گئے۔ جس روز میں جا رہا تھا سب ہی اداس تھے۔ لیکن اس نے تو رو رو کر اپنی آنکھیں سجا لی تھیں۔ اور کتنی ہی بار کہا تھا۔

"کمال بھائی! میں آپ کو بہت مس کروں گی۔"

"اور کیا میں مس نہیں کروں گا۔ تم لوگ تو سب ساتھ ہو گے اور میں وہاں اکیلا۔"

میں نے اسے بہلایا تھا، حالانکہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس کے سارے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چن لوں اور اس سے کہوں۔

"افی! میں وہاں تمہارے بغیر ہر لمحہ بہت مشکل سے گزاروں گا، کیا تم نہیں جانتیں؟"

"کمال بھائی! آپ کے جانے کے بعد مجھے کالج کون ڈراپ کرے گا؟" اس نے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا تو مجھے اس کی معصومیت پر ہنسی آ گئی۔ اور جمال نے اسے چھیڑا۔

"کمال بھائی! افی کو آپ کے جانے کا غم بالکل نہیں ہے۔ وہ اس لیے رو رہی ہے کہ اب اسے کون ڈراپ کرے گا۔"

"نہیں۔ نہیں۔" اس نے شاکی نظروں سے جمال کو دیکھا۔ "میں کمال بھائی کو سچ سچ بہت مس کروں گی۔ یہ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں بہت یاد کروں گی انہیں۔"

بے اختیار اور بے ساختہ اظہار مجھے اندر تک مالا مال کر گیا تھا۔

"مجھے یقین ہے افی!" میں نے اس کی صورت آنکھوں میں اتارتے ہوئے کہا۔ "اور میں بھی تمہیں سب سے زیادہ یاد کروں گا۔"

اور پھر جہاز میں اس کی وہ صورت مسلسل میری آنکھوں میں رہی۔

آنکھوں میں جھلملاتے تارے

اور ہونٹوں پر مسکراہٹ

وہ بیک وقت مسکرا بھی رہی تھی اور رو بھی رہی تھی۔

"کمال بھائی مجھے سب سے زیادہ یاد کریں گے۔" وہ نہال اور جمال کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی تھی مان سے فخر سے۔

اور میں نے دل ہی دل میں عہد کیا تھا۔

"افی افرا! میں تمہیں ہمیشہ سب سے زیادہ چاہوں گا۔" میں نے تو اپنا عہد نبھایا۔ میں نے ہمیشہ اسے سب سے زیادہ چاہا۔

وہ میرے دل میں ہمیشہ براجمان رہی اگرچہ زندگی

میں شامل نہ ہو سکی۔ وہ بڑی سی تصویر جو عید پر جمال نے مجھے بھیجی تھی جس میں وہ اماں بابا کے درمیان میں کھڑی مسکرا رہی تھی اور اماں بابا کے ارد گرد نہال اور جمال تھے اور جسے میں نے انلارج کروایا تھا۔ ہمیشہ میری ٹیبل پر دھری رہتی ہے۔ کئی بار اوج اور بلال نے بچپن میں پوچھا تھا۔

"نہال اور جمال چاچو کے علاوہ یہ اس تصویر میں کون ہے؟"

اور میں نے بتایا تھا کہ ہماری ایک عزیزہ ہیں۔ اماں بابا کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔"

حالانکہ میرا دل کہتا تھا۔

"یہ میری زندگی تھی جو چھن گئی۔ اور پتا نہیں میں کیسے سانس لے رہا ہوں اس کے بغیر شاید صرف جی رہا ہوں۔"

جمال اور نہال آتے تو کتنی ہی دیر تک تصویر کے پاس کھڑے رہتے۔ وہ دونوں اب بھی اسے یاد کرتے تھے۔

"یہ ہماری بہت پیاری بہن ہے۔"

ایک بار جمال نے اوج کو بتایا۔ تو اوج نے سوال کر کر کے اسے زچ کر دیا۔

"تو یہ اب کہاں ہیں؟ ہمارے گھر کیوں نہیں آتیں اور یہ کتنی خوبصورت ہیں۔ ان کی آنکھیں کتنی پیاری ہیں۔"

وہ ہمیشہ مجھ سے تصدیق چاہتی اور پھر صبا کی تائید۔

"ہاں بیٹا! یہ بہت خوبصورت ہے۔ بہت پیاری۔ خالہ جان اور خالو جان نے تو سگی بیٹیوں کی طرح ہی سمجھا تھا اسے لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس کی شادی کے بعد تم لوگوں نے اس سے رابطہ کیوں نہ رکھا اور نہ ہی وہ کبھی پلٹ کر آئی۔ حالانکہ نہال اور جمال اکثر اسے یاد کرتے ہیں۔ اور نہال تو اکثر اپنے بچوں سے کہتا ہے "تمہاری ایک پھپھو بھی رہتی ہیں کہیں اسی دنیا میں۔"

اوج سے بات کرتے کرتے صبا میری طرف متوجہ ہو جاتی۔ میں اس سے کیا کہتا کیا بتاتا کہ ایسا کیوں ہے۔

خود میں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اماں نے ایسا کیوں کیا۔ اور پھر بابا نے بھی انہیں نہیں روکا۔ اسے بیاہ کر اس کی خبر تک نہ لی۔ آخر بیٹیوں کی طرح چاہا تھا انہوں نے اسے۔

اور اماں بھی کتنے لاڈ اٹھاتی تھیں اس کے۔ پھر بھی انہوں نے اسے حمید اللہ علوی سے بیاہ دیا جو عمر میں اس سے دگنا بڑا تھا۔ جس کے بچے اس کے ہم عمر تھے۔ صرف اس لیے کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں اس سے محبت کرتا تھا۔ اور اماں نے میرے لیے صبا کو مانگ رکھا تھا۔ بچپن سے ہی اس وقت سے جب خالہ جان اچانک بیمار ہو گئی تھیں اور صبا اماں کی گود میں چلی آئی تھی۔ اور میں جو صبا کے آنے پر بہت خوش تھا ہر وقت اس کے گرد گھومتا رہتا تھا۔ ظاہر ہے گھر میں کوئی دوسرا بچہ نہ تھا اس لیے میں صبا کی آمد پر خوش تھا۔ پھر جب میری عمر ہی کیا تھی صرف تین سال اور ایک سال کی گلابی گلابی گول گوتھنی سی صبا مجھے بہت اچھی لگتی تھی اور اکثر اسے گود میں اٹھانے کی کوشش میں اسے گرا دیتا اور شاید تب ہی اماں نے صبا کو میری دلہن بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور جب دو سال بعد خالہ جان مکمل صحت یاب ہو گئیں اور صبا کو سنبھالنے کے قابل تب صبا کو لے گئیں اور تب تک جمال میاں بھی تشریف لا چکے تھے۔ اس لیے مجھے صبا کی کمی بالکل محسوس نہ ہوئی۔ لیکن اماں نے صبا کو خالہ جان کی جھولی میں ڈالتے ہوئے ان کے کان میں بات ڈال دی تھی۔

"آپا! صبا میری امانت ہے یاد رکھیے گا میرے کمال کی دلہن۔" اور پھر وقتاً فوقتاً وہ اس کی یاد دہانی بھی کرواتی رہیں لیکن میں تو اس بات سے قطعی بے خبر تھا اس روز جب اماں نے مجھے لکھا۔

"کمال! پڑھائی ختم ہوتے ہی لوٹ آنا۔ جاب وغیرہ مت کرنا۔ آپا صبا کے لیے پریشان رہتی ہیں۔ ان کی پرانی بیماری لوٹ آئی ہے۔ دراصل ان کو دل کی تکلیف تھی اور وہ اپنی زندگی میں ہی صبا کو اپنے گھر میں آباد دیکھنا چاہتی ہیں۔"

www.allurdu.com

ایک لمحہ کو تو میں ششدر رہ گیا تھا۔ صبا کے لیے تو میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ اسی کی آمد سے پہلے بھی کبھی میرے دل میں اس کا اس طرح سے خیال نہیں آیا تھا۔ حالانکہ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ لیکن محبت تو ذات سے ہوتی ہے۔ شکل و صورت حسن و خوبصورتی سے نہیں۔

تب میں نے اماں کو ساری تفصیل لکھ دی کہ میں اقرا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ خیال تب سے میرے دل میں ہے جب وہ ہمارے گھر آئی تھی اور یہ خیال اب اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ اسے دل سے کھرچا نہیں جاسکتا۔ میں نے ان اڑھائی سالوں میں بھی کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا اس لیے کہ میرے دل میں کسی کے لیے جگہ نہ تھی۔ وہ بھرا ہوا اور آباد تھا۔

کلاس کی خوبصورت ترین لڑکی این بھی مجھے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔ ایک بار اس نے بے حد حیران ہو کر مجھ سے پوچھا تھا۔

"کیا تمہاری کسی سے کمٹ منٹ ہے؟"

"ہاں۔۔۔۔" اور اس کی آنکھوں میں دم توڑتی امیدوں کو نظر انداز کرتا میں وہاں سے چلا گیا تھا۔ یہ امریکن لڑکیاں بھی عجیب ہوتی ہیں اس کوشش میں رہتی ہیں کہ کوئی پاکستانی یا ہندوستانی انہیں شادی کی آفر کرے اور وہ اسے قبول کر لیں۔ ان میں گھر بسا کر رہنے کی شدید خواہش چھپی ہوتی ہے۔ حالانکہ اکثریت کے گھر نہیں بن پاتے "بس وقتی ساتھی ہوتا ہے جو ان کے ساتھ ساتھ ان کے اپارٹمنٹ کو بھی شیئر کرتا ہے اور پھر ذرا سے اختلافات پر دونوں اپنی اپنی راہ پر چل پڑتے ہیں۔ اور اب یہ کیسے ممکن تھا کہ صبا کے لیے کوئی جگہ بن پاتی۔ مجھے اماں اور بابا کی وسعت نظر کا پتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ انہیں میری پسند پر اعتراض نہیں ہوگا۔ پھر اقرا سے وہ خود کتنا پیار کرتی تھیں۔ لیکن میرا یقین غلط ہو گیا۔ خط ملتے ہی اماں کا فون آگیا۔

"یہ ناممکن ہے کمال! تمہاری شادی صبا سے ہی ہو گی۔۔۔ اور یہ آج کی بات تو نہیں ہے۔ میں نے برسوں سے آپا سے کمٹ کر رکھا تھا۔ اور جانتے ہو "آپا کے سسرال میں کتنوں نے ہی صبا کو مانگا لیکن آپا نے سب سے یہی کہا کہ صبا کو تو میں نے تمہارے لیے مانگ رکھا ہے اور اب تم چاہتے ہو کہ آپا کو سسرال میں شرمندگی ہو۔ کتنے اچھے اچھے رشتے تمہارے لیے آپا نے ٹھکرائے۔ ان کی نند کا بیٹا تو تم سے بڑا افسر تھا۔ ہم سے زیادہ دولت مند تھے۔"

"مگر اماں پلیز، جمال بھی تو ہے نا۔ آپ صبا کی شادی جمال سے بھی تو کر سکتی ہیں۔"

میں نے التجا کی لیکن اماں تو میری بات سننے کو تیار ہی نہ تھیں۔ کسی طور بھی۔ تب میں نے سوچا تھا کہ میں یا فون پر میں اماں کو منا نہیں سکتا۔ وہاں جا کر میں انہیں قائل کر لوں گا۔ خود خالہ جان سے بات کر لوں گا۔۔۔۔ جمال سے پوچھ لوں گا۔ جمال میں کیا کمی تھی۔ یقیناً "خالہ جان کو انکار نہیں ہوگا۔ لیکن اماں نے اتنی جلدی کی۔ میرے آنے کا بھی انتظار نہیں کیا اور میرے آنے سے صرف تین دن پہلے اقرا کو حمید اللہ علوی سے بیاہ دیا۔

حمید اللہ علوی جو تین جوان بچوں کا باپ تھا۔ میں نے گھر آتے ہی چاروں طرف اسے تلاش کیا تھا اور جب وہ نظر نہ آئی تو میں نے جمال سے پوچھا تھا۔

"اقی کہاں ہے؟"

"بھیا" پتا نہیں کیوں مجھے اس کی آنکھوں میں اداسی سی نظر آئی تھی۔ "ان کی شادی ہو گئی۔ تین دن پہلے حالانکہ میں نے اور جمال نے کتنا کہا تھا اماں سے کہ آپ کا انتظار کر لیں۔۔۔۔ جبکہ تین دن بعد آپ آ ہی رہے تھے۔ اور وہ ہماری بہنوں کی طرح تھی۔ ہم تو بہت دھوم دھام سے اس کی شادی کرنا چاہتے تھے۔۔۔۔ اور پھر" اس کی آواز بھرا گئی۔ "کسی ایسے شخص سے ہرگز نہیں جو تین بچوں کا باپ بھی ہو۔"

میں ساکت بیٹھا تھا۔ جیسے کسی نے میری روح کھینچ لی ہو۔

"پتا نہیں اماں اور بابا کو کیا جلدی تھی۔ وہ تو آئی

جہاں لگے خوب سجے
شہزادی گارمنٹس ایمبرائڈری
تصور سے حقیقت تک کوشاں

گارمنٹ مصنوعات کی دنیا میں حیرت انگیز انقلاب۔ جاپان اور جرمنی کی کمپیوٹرائزڈ ایمبرائڈری مشینیں اور جاپان، جرمن کے تربیت یافتہ ماہرین آپ کی خدمت کے لئے منتظر ہیں
نہایت مناسب ریٹ، کام کی گارنٹی، لاتعداد نت نئے ڈیزائن، شوخ کلرز میں آپ کی گارمنٹس مصنوعات کی فروغ کیلئے حاضر ہیں بہلے ہوزری گارمنٹس لیڈیز گارمنٹس اسکول یونیفارم وغیرہ

شہزادی پرائیویٹ لمیٹڈ

PH: 685500 - 671593
FAX : 6313215
W-S-A/4, BLOCK 13, فیڈرل بی ایریا۔ نصیر آباد۔ کراچی
شوروم، شہزادی سینٹر میٹھادر کراچی۔ فون نمبر 226457 فیکس: 2430811

بھاری تھی کہ کوئی بھی شخص اسے اپنی شریکِ زندگی کر کے فخر محسوس کرتا۔۔۔ پھر ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔"

وہ ذرا سا خاموش ہوا اور پھر دوبارہ بولنے لگا۔

"جمال نے تو اماں سے لڑائی بھی کی۔ آپ کو تو پتا ہے نا غلط بات اس سے برداشت ہی نہیں ہوتی۔ اس نے اماں سے کہا۔ "آپ کو اتنی جلدی کیا تھی۔ اتنی بھاری ہو گئی تھی تو مجھ سے کہا ہوتا۔۔۔ میں ڈھونڈ لیتا کوئی رشتہ اس کے لیے جو اس کا ہم عمر ہوتا۔ لیکن آپ نے۔۔۔"

"اماں کا خیال ہے کہ عبداللہ نے بہت چاہت سے اسے اپنایا ہے اور اس کے پاس پیسے کی فراوانی ہے اور وہ انی کو خوش رکھے گا۔ آپ ہی بتایئے بھیا کیا دولت سے آدمی کو خوش رکھا جا سکتا ہے۔ کیا انی بجو خوش ہوں گی۔ وہ تو اس قدر روئی تھیں کہ جل تھل کر دیا تھا انہوں نے۔"

میرے اندر سب کچھ ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ یہ اماں نے کیا کر دیا تھا۔ اور کیوں؟ مجھے وہ میری بات نہ مانتیں۔ میری شادی صبا سے ہی کر دیتیں لیکن انی پر یہ ظلم نہ کرتیں۔ اس نے کیا بگاڑا تھا ان کا؟ ایک بیٹی کی طرح ان کی خدمت کی تھی۔ انہیں چاہا تھا۔ جمال اور نمال سے سگی ماؤں جیسی محبت کی تھی۔ غلطی تو میری تھی قصوروار تو میں تھا۔ پھر مجھے سزا دی ہوتی۔ اسے کیوں سزا دی۔

پتا نہیں نمال نے اور کیا کیا کہا تھا۔

میں نے کچھ سنا ہی نہیں۔

جمال کپڑے تبدیل کر کے آیا تو وہ بھی ناراضی کا اظہار کر رہا تھا۔۔۔ مگر میرے اندر تو جیسے سب کچھ مر گیا تھا۔۔۔ ختم ہو گیا تھا۔

ہولے ہولے میرا دل پاتال میں گرتا جا رہا تھا۔ میں چپ بیٹھا تھا۔

"بھائی! آپ تھک گئے ہیں شاید۔ کچھ دیر آرام کر لیں۔ اتنی طویل فلائٹ۔"

جمال نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو مجھے لگا جیسے میں بھربھری مٹی کی دیوار کی طرح بیٹھا جا رہا ہوں۔

"کمال بھائی!" جمال نے گھبرا کر مجھے سہارا دیا۔

"کیا ہوا آپ کو؟"

میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ واقعی تھک گئے ہیں کمال بھائی! آپ آرام کریں۔ رات کو کھانے پر باتیں ہوں گی۔"

جمال نے خود ہی اندازہ لگایا۔ میں پتا نہیں کیسے اپنے کمرے تک آیا تھا۔ مجھے یاد نہیں۔ جمال مجھے آرام کرنے کی تاکید کر کے چلا گیا اور میرا دل چاہ رہا تھا میں چیخ چیخ کر روؤں اپنی بے بسی اور انی کی بدنصیبی پر۔

یہ میں ہی تھا جس کی وجہ سے اماں نے یہ فیصلہ کیا تھا شاید۔ وہ سمجھتی تھیں کہ میرے آنے سے پہلے انی اپنے گھر کی ہو جائے گی تو میں بغاوت نہ کر سکوں گا۔ وہ خالہ کے سامنے سرخرو ہو گئی تھیں لیکن میرا سر تو ہمیشہ کے لیے انی کے سامنے جھک گیا تھا۔

میرا جی چاہ رہا تھا میں اپنے آپ کو سزا دوں۔ کوئی سخت سزا۔ کوئی ایسی سزا کوئی ایسی تکلیف جو میرے غم کا مداوا کر سکے جو احساسِ ندامت ختم کر دے۔

میں نے اپنا گریبان چاک کر لیا۔

اپنے آپ کو زخمی کر ڈالا اور اپنا سر زور زور سے بیڈ کی سائیڈ پر مارا۔

خدایا میں کیا کروں، میرے پاس کچھ نہیں بچا تھا، میں ایک دم خالی ہو گیا تھا۔ جانے کتنی دیر گزر گئی تھی۔ مجھے خبر نہیں ہوئی۔۔۔ میں زمین پر بیٹھ گیا تھا اور اپنا سر بیڈ کی پٹی پر رکھ دیا تھا اور بلک بلک کر رونے لگا۔ میں نے کتنی بار ہاتھ اٹھا کر آنسو پونچھنے کی کوشش کی لیکن میرے رخسار خشک تھے۔

آنکھیں تپتے صحرا کی طرح دہک رہی تھیں اور روتے روتے میری آواز بیٹھ گئی تھی۔ میں یونہی بیٹھا تھا جب میرے وجود میں ارتعاش پیدا ہوا۔ میری سماعتوں میں جیسے گھنٹیاں سی بجیں۔ یہ آواز۔۔۔ اس آواز کو سننے کے لیے میں اڑھائی سال ترسا تھا۔

"نمال! نمال!" وہ نمال کو بلا رہی تھی۔ "نمال

بھائی آ گئے کیا؟ اور یہ کہاں چھپ گئے ہیں وہ۔"

اس کی آواز میں زندگی تھی۔ زندگی کا رس تھا۔ خوشبوؤں کی لے تھی۔

میں لڑکھڑاتے ہوئے اٹھا۔

زردی کے کام والے سبز رنگ کے سوٹ میں ملبوس ایک ہاتھ میں سونے کی چوڑیاں دوسرے ہاتھ میں بریسلیٹ ہلکا سا میک اپ کیے ساتھ میچنگ جیولری کا سیٹ

یہ روپ۔۔۔ نہیں اس روپ میں تو میں نے صرف اسے اپنے لیے دیکھا تھا۔ لیکن یہ کون تھا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے کچھ کہتا ہوا۔

"عبداللہ علوی!"

نمال نے جیسے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"انی کا دولہا۔ تین بچوں کا باپ۔"

میں تہی داماں رہ گیا تھا، خالی ہو گیا تھا۔ میں جس نے اسے برسوں سوچا تھا۔ امریکہ جیسے ملک سے خود کو اس کے لیے صرف اس کے لیے بچا کر لے آیا تھا۔۔۔ خالی کھڑا تھا۔ میں نے اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھا۔۔۔ اپنے سونے دل کو دیکھا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

میں ایک بار پھر دیواروں سے سر مارنے لگا پھر شاید جمال اور نمال نے میری آوازیں سن لی تھیں۔ وہ بھاگتے ہوئے میرے کمرے میں آئے تھے۔ جمال نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا تھا۔

"کمال بھائی!"

"جمال! مجھے یہاں سے لے چلو۔۔۔ انہوں نے اماں نے بابا نے مجھے لوٹ لیا ہے۔ میرا دل خالی کر دیا ہے۔"

میں اس سے لپٹ گیا تھا۔ جمال کتنی ہی دیر تک مجھے اپنی بانہوں میں بھینچے رہا اور میں روتا رہا۔ سسکتا رہا۔

پھر جانے منظر کیسے بدل گیا تھا۔ میں ہوش میں آیا تو ہاسپٹل کے ایک کمرے میں تھا۔ میرے سامنے اماں تھیں، بابا تھے، جمال تھا، نمال تھا لیکن میں کسی کو نہیں پہچانتا تھا۔ بس خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتا۔ ڈاکٹر آتے اور پوچھتے۔

"ہیلو ینگ مین! کیا تکلیف ہے تمہیں۔۔؟"

"ہاں! تکلیف تو کوئی نہیں۔ بس اندر خالی خالی لگتا ہے۔ ڈاکٹر! میرا اندر بالکل خالی ہے۔ وہاں کچھ نہیں ہے۔"

اماں سر جھکائے روتیں۔ اور میں حیران ہو کر سوچتا۔۔۔ یہ عورت کیوں روتی ہے میرا اس سے کیا ناتا ہے۔۔۔ دن رات میرے سرہانے بیٹھی رہتی ہے۔ ایک بار نہیں کئی بار میں اس سے پوچھتا کہ میرا آپ کے ساتھ کیا رشتہ ہے معزز خاتون؟"

"میں تمہاری ماں ہوں بیٹا! تم مجھے کیوں نہیں پہچانتے۔"

"نہیں میری تو کوئی ماں نہیں ہے معزز خاتون! میں تو شاید آسمان سے ٹپکا تھا، نہیں جہاز سے گرا تھا۔۔۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بڑے جہاز نے مجھے نیچے گرا دیا تھا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں یہاں تھا اس اسپتال میں۔"

مجھے بجلی کے شاک لگائے جاتے۔ میں تڑپتا۔ میں اپنا آپ کھو بیٹھا تھا۔ اور مجھے واپس پلٹنے میں دو سال سے زیادہ لگ گئے۔۔۔ تب تک اماں بابا اب وہ گھر چھوڑ کر ساہیوال سے لاہور شفٹ ہو گئے تھے۔ یوں بھی بابا نے ریٹائرمنٹ لے لی تھی اور اماں کا خیال تھا کہ میں بیمار ہوں ہاسپٹل میں ہوں تو وہ میرے قریب رہنا چاہتے ہیں۔ اماں نے اس شہر سے ہی ناتا توڑ لیا تھا جہاں وہ رہتی تھی۔ گھر میں بھی اس کا ذکر نہ ہوتا۔ کبھی نمال یا جمال کے منہ سے اس کا نام نکلتا تو وہ فوراً خاموش ہو جاتے۔۔۔ میں جانتا تھا کہ اماں نہیں چاہتیں کہ میں پھر کبھی اس کا سامنا کروں اور ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاؤں۔۔۔ میں نے چپ سادھ لی تھی۔

میں نے کبھی کسی سے گلہ نہیں کیا۔

نہ اماں سے نہ بابا سے۔

اور اماں کے کہنے پر صبا سے شادی بھی کر لی۔

وہ جو اتنے عرصے سے میرے انتظار میں بیٹھی تھی اسے میں کس جرم کی سزا دیتا۔ اماں اور بابا نے سب

سے یہی کہا تھا کہ ایرپورٹ سے گھر آتے ہوئے میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا..... دماغ پر چوٹ لگی۔ جس سے ذہن متاثر ہوا۔ اور میرے لیے صبا نے انتظار کیا تھا۔ وہ چاہتی تو شادی کر سکتی تھی حالانکہ خالہ نے کہا بھی تھا کہ کمال نہیں تو جمال ہی سہی اور اماں کو بھی اعتراض نہ تھا لیکن صبا نے انکار کر دیا۔

"کمال کے ساتھ یہ حادثہ مجھ سے شادی کے بعد بھی ہو سکتا تھا پھر..... میں کمال کے صحت مند ہونے کا انتظار کروں گی۔"

صبا کی اس اعلا ظرفی نے مجھے متاثر کیا تھا لیکن صبا سے شادی کا فیصلہ کرنے سے چند دن پہلے میں نے کسی طرح حمید اللہ علوی کا فون نمبر لے کر اسے فون کیا تھا..... پتا نہیں کیوں جی چاہتا تھا ایک بار اس کی آواز سن لوں۔

"کمال بھائی!" میری آواز سن کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ "آپ ٹھیک ہیں۔"

"میں ٹھیک ہوں افی! تم خوش ہو؟ ٹھیک ہو؟"

"ہاں میں خوش ہوں۔" میں نے اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی محسوس کی تھی۔

"ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا افی! اماں اور بابا نے تمہارے ساتھ جو زیادتی کی ہے اس کے لیے میں قصوروار ہوں۔"

"پلیز کمال بھائی! ایسا مت کہیں۔"

"تم نہیں جانتیں افی۔"

"میں سب جانتی ہوں۔ اماں نے مجھے یہاں سے جاتے ہوئے سب بتا دیا تھا..... انہوں نے میرے لیے جو فیصلہ کیا اچھا کیا۔ حمید بہت اچھے ہیں..... لیکن..... لیکن آپ سب لوگ مجھے بہت یاد آتے ہیں..... نمال، جمال، اماں، بابا سب۔ لیکن اماں نے کہا تھا میں سب کو بھول جاؤں اس لیے کہ یہی بہتر ہے سب کے لیے۔"

اس نے سسکی لی۔

"انہوں نے کہا تھا اگر کبھی آپ مجھ سے ملنا چاہیں۔ مجھ سے بات کرنا چاہیں تو میں آپ سے نہ ملوں۔ نہ بات کروں۔ آپ آئندہ مجھے فون نہ کریں کمال بھائی۔ میں احسان فراموش نہیں کہلوانا چاہتی۔"

وہ رونے لگی۔

"مجھے سب بہت یاد آتے ہیں۔ لیکن میں کیا کروں کیا کروں۔"

اس نے روتے روتے فون رکھ دیا تھا۔

اور سکندر نے کتنا سچ کہا تھا کہ انہوں نے افی پر ظلم کیا..... اس لیے کہ وہ ان کی سگی بیٹی نہ تھی۔ اگر وہ سگی بیٹی ہوتی تو ایسا ہرگز نہ کرتے۔

میں نے راتوں کو اماں اور بابا کو اس کی باتیں کرتے سنا ہے۔ اماں اکثر اسے یاد کر کے رویا کرتی تھیں۔

بابا ٹھنڈی آہیں بھرتے۔

جمال اور نمال اداس پھرتے۔

لیکن ظلم تو ہو گیا تھا اس کے ساتھ۔ وہ بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی۔

اور پھر اس نے کتنی تکالیف اٹھائیں۔ ان کی تفاصیل تو سکندر نے نہیں بتائی تھیں۔ لیکن ان تکالیف کے نشانات اس کے وجود پر ثبت تھے..... مگر اس نے ہمیں نہیں پکارا اماں کے ساتھ کیا ہوا عہد نبھایا۔

اور اگر وہ ہمیں یاد آتی تو کیا نمال، جمال، اماں، بابا اس کی طرف نہ جاتے۔ اسے سینے سے نہ لگا لیتے۔ وہ تو سمجھتے تھے کہ وہ حمید اللہ علوی کے ساتھ خوش ہے، مطمئن ہے۔ میرا جی چاہا میں سکندر کو سینے سے لگا لوں۔ اسے بہت پیار کروں اور اس کے وہ نامعلوم آنسو جو دکھائی نہیں دیتے تھے لیکن جن کی نمی میں اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا اپنے ہاتھوں سے پونچھوں۔ مجھے اس کے وجود سے افی کی خوشبو آ رہی تھی لیکن بار ندامت سے میری نظریں نہیں اٹھ رہی تھیں۔

"افی علوی جب مری تو میں گیارہ سال کا تھا۔"

وہ کہہ رہا تھا اور میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ اپنی ماں کا ذکر کس طرح کر رہا تھا۔ جیسے وہ اس کی ماں نہ ہو کوئی اجنبی عورت ہو۔

www.allurdu.com

شاید زندگی نے اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک نہیں کیا۔ گیارہ سال کی عمر میں اکیلا رہ گیا تھا۔ اور افزا۔

اف اتنا عرصہ قبل دنیا چھوڑ گئی تھی مگر میرے دل میں تو وہ ہمیشہ رہی تھی۔ میرا دل رو رہا تھا۔ لیکن میں ضبط کیے بیٹھا رہا۔ اور میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اسے ناکام نہیں لوٹاؤں گا۔ حالانکہ صبا نے مخالفت کی تھی۔

"اس کا کوئی خاندان نہیں۔ نہ ماں نہ باپ، نہ بہن بھائی ۔۔۔ اکیلے لڑکے کو اوج کا رشتہ دیتے میرا دل نہیں مانتا۔"

"پاگل ہو تم۔ اوج اس کے ساتھ کام کرتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ دو سال تک یونہی چلا گیا ہے۔ یقیناً دونوں کے درمیان پسندیدگی کا کوئی جذبہ رہا ہو گا تب ہی تو۔"

لیکن اوج نے میرے خیال کی نفی کر دی۔ وہ سکندر سے شادی کے لیے رضامند نہ تھی اس کا خیال تھا کہ اس کا مزاج بہت عجیب سا ہے ۔۔۔ وہ دوسروں کو بے بس دیکھ کر خوش ہوتا ہے ۔۔۔ بے شمار خوبیوں کے باوجود شادی کے لیے وہ موزوں نہیں ہے۔ لیکن میں نے اسے سمجھایا کہ وہ اپنی محبت سے اسے جیت لے۔ اسے اس کے حصار سے باہر لے آئے۔ زمانے نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا مگر وہ ایک بہترین انسان ہے ۔۔۔ میں چاہتا تھا اوج کے ساتھ۔ اس کی شادی کر کے میں اس دکھ کی بھی زیادتی کی تلافی کر دوں جو اماں اور بابا نے اس کے ساتھ کی تھی یا صرف اماں نے 'بابا نے ایک بار کہا تھا۔

"یہ فیصلہ تمہاری اماں کا تھا۔ میں اس میں شریک نہ تھا۔"

پھر وہ افزا کا بیٹا تھا اور اس سے بڑھ کر مجھے اور کون عزیز ہو سکتا تھا ۔۔۔ اوج بہت ذہین ہے 'ہمیشہ سے اس نے میری خواہش جان لی تھی سو اس نے ہاں کر دی۔

میرا خیال تھا وہ محبتوں سے دور اجنبیوں میں پلا ہے' محبتوں کے ذائقے سے ناآشنا ہے۔ اس لیے اتنا کھردرا اور اتنا سخت ہے۔ ایک گھر بنے گا محبت ملے گی تو خود ہی بدل جائے گا ۔۔۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

میں نے کئی بار اوج سے پوچھا تھا کہ کیا وہ خوش ہے۔ اگرچہ وہ اثبات میں جواب دیتی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں مجھے ایک الجھن دکھائی دیتی تھی۔ اس کے چہرے پر وہ خوشی مفقود تھی جو نئی نویلی دلہنوں کے چہرے پر ہوتی ہے۔ کیا میں نے اوج کی شادی سکندر کے ساتھ کر کے غلطی کی ہے۔ ایک غلطی ایک زیادتی کی تلافی کرنے کے لیے کیا میں ایک اور زیادتی کا مرتکب ہو چکا ہوں ۔۔۔

میں نے کئی بار سوچا اور پھر ایک دن اوج چلی آئی تھکی ہاری اور درماندہ۔ وہ ہمت ہار گئی تھی۔ میرے سینے سے لگی کتنی ہی دیر تک وہ روتی رہی ۔۔۔ اور میں ہیوم ہوتا رہا۔ میں نے سوچا تھا سکندر سے بات کروں گا اسے سمجھاؤں گا لیکن اوج تو کوئی بات سننے کو تیار ہی نہ تھی۔

"مجھے واپس نہیں جانا۔ مجھے سکندر سے بات نہیں کرنا۔"

وہ بہت ہرٹ ہوئی تھی۔ سکندر نے اسے بہت تکلیف دی تھی۔ کاش ۔۔۔ اے کاش سکندر اور اوج ہمیشہ اکٹھے رہ سکتے ۔۔۔ میرا برسوں کا خالی دل سکندر کو دیکھ کر 'اسے اپنا کر بھر گیا تھا۔ مجھے لگتا تھا' میں اب تہی داماں نہیں رہا۔

اسے دیکھ کر میری آنکھیں ٹھنڈی ہوتی تھیں۔ اور میرے سینے پر دھری غم کی سلیں پگھلتی جا رہی تھیں۔

لیکن اب ایک بار پھر میرے دل پر جیسے کسی نے بھاری سلیں دھر دی تھیں۔ میں اوج کی پریشان صورت دیکھتا تو میرے اندر کوئی روتا۔

پھر بلال اور صبا خلع کی بات کرنے لگے۔

"ابھی وہ ینگ ہے۔ ابھی نئی زندگی کا آغاز کر سکتی ہے ۔۔۔ بھائی جان طلال کے لیے خواہاں ہیں۔"

صبا کہتی تو میرے دل میں جیسے بھالے اتر جاتے' میں اندر سے زخم زخم ہو جاتا۔ لیکن اوج نے خلع لینے

سے صاف انکار کر دیا۔

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں انتظار تھا ۔۔۔ سکندر کا انتظار۔ وہ فون کی گھنٹی پر چونک چونک کر ریسیور اٹھاتی۔ اس کا غصہ اتر چکا تھا۔ اور اسے سکندر کا انتظار تھا۔ تب میں اسد ملک کی طرف چلا گیا۔ میں جاننا چاہتا تھا۔ سکندر کہاں ہے ۔۔۔ اور تب اسد ملک نے ہی مجھے بتایا۔ مجھے لگا جیسے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ جیسے غم کی بھاری سلیں میرے سینے سے ہٹ گئی ہیں ۔۔۔ جیسے میں نے اس زیادتی کی تلافی کر دی ہے۔ جو برسوں پہلے افزا کے ساتھ ہوئی تھی۔

جس روز سکندر آیا تھا تو میں نے اسد ملک کے ساتھ اسے ایئرپورٹ پر ریسیو کیا۔ لیکن میں نے اوج کو نہیں بتایا۔

اسد نے کہا تھا کہ "سکندر اس طرح اوج کے پاس جانا چاہتا ہے کہ اس کی ذات میں کوئی گنجلک نہ ہو۔ کوئی ابہام باقی نہ ہو۔"

اور میں نے سکندر کا بھرپور ساتھ دیا ۔۔۔ حالانکہ اوج کو اداس دیکھ کر کتنی بار میرا جی چاہا کہ میں اسے بتا دوں 'سکندر کے متعلق لیکن پھر سکندر کی ہدایت کا سوچ کر چپ ہو جاتا۔

بالآخر وہ دن آیا جب ڈاکٹر صدیقی نے اسے او کے کر دیا۔ اس روز مجھے سکندر پر بہت پیار آیا ۔۔۔ میں کتنی دیر تک اسے گلے سے لگائے کھڑا رہا۔ اپنی ذات کے حصار سے نکل کر وہ بہت خوش اور مطمئن تھا۔

اس کی آنکھوں کا حزن جو مسلسل دھند کی طرح اس کی آنکھوں میں چھایا رہتا تھا اور اس کے پورے وجود سے جھلکتا تھا۔ آج نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبتوں کے سمندر مچل رہے تھے اور خوشی پورے وجود سے پھوٹی پڑ رہی تھی ۔۔۔

بالآخر اوج کے لیے اس کی محبت کی خاطر اس نے خود کو اس حصار سے نکال لیا تھا جو اس کی ذات کی روشنیوں کو کھائے جا رہا تھا۔

"سکندر!" شدت جذبات سے اس کی آواز بھرا رہی

بہنوں کا اپنا خوبصورت ماہنامہ

حنا

اپریل کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

اپریل 2001ء کے شمارے کی ایک جھلک

بند دروازوں پر دستک ...... غزال جلیل راؤ کا مکمل ناول

دل کے آنگن میں ...... شازیہ کا خوبصورت ناولٹ

فلک پر کہکشاں ...... افسر سلطانہ کا ناولٹ

گئی رتوں کی بہار ...... نوید درانی کا ناولٹ

منیزہ ہاشمی، زرین اطہر صدیقی اور اقبال بانو کے افسانے

زرین آرزو کا دلچسپ سلسلے وار ناول

دل بے چین سمندر

مریم ماہ منیر کا سلسلے وار ناول

یہیں آ کے رکتے تھے قافلے

انٹرویو، پیارے نبی کی پیاری باتیں، انشاء نامہ اور دیگر بھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

اپریل کا شمارہ آج ہی خرید لیں

تھی۔ میں نے اسے خود سے لپٹا لیا تھا۔ ڈاکٹر صدیقی کے پاس میں نے اس کی فائل میں اس کی خودنوشت پڑھی تھی۔ میں نے اس کے کندھے تھپکے تھے۔ اور اسے اپنے ساتھ لے کر جب میں گھر کی طرف آرہا تھا۔ تو میرا دل بھرا ہوا تھا...... برسوں بعد مجھے لگا تھا جیسے میرا خالی دل آباد ہو گیا ہو۔ گھر میں رونق لگ گئی تھی۔

جمال اور نہال کسی سرپرائز کے انتظار میں گھر میں موجود تھے۔ جمال تو اکیلا ہی اوج کی شادی میں صرف ایک دن کے لیے شریک ہونے آیا تھا جبکہ نہال شریک نہیں ہو سکا تھا اور وہ تین ماہ پہلے ہی وہ لوگ وطن واپس آئے تھے......

"سکندر بیٹا!" ٹی۔ وی لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔

"آج میں تمہیں اوج ہی کو نہیں لوٹا رہا بلکہ تمہارے کچھ کھوئے ہوئے رشتے بھی تم کو واپس کر رہا ہوں۔"

"یہ تمہارے جمال ماموں ہیں۔ جو خود کو بہت بہادر سمجھتے تھے لیکن......"

میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"اور یہ تمہارے نہال ماموں ہیں۔ تمہاری ماں کے بہت ہی لاڈلے بھائی...... جو گزر گیا۔ اس کا ذکر مت کرنا اور کچھ مت پوچھنا۔"

"ماموں جان! ماما آپ کو بہت مس کرتی تھیں۔ بہت یاد کرتی تھیں۔ انہوں نے آپ کی ایک ایک بات سینکڑوں بار مجھے بتائی۔"

وہ نہال کے گلے لگا رو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور میرا دل سرشار ہو رہا تھا۔ اس نے افزا کو افزا علوی نہیں کہا تھا "ماما" کہا تھا...... ڈاکٹر صدیقی نے سچ کہا تھا اس نے اپنی ذات کا حصار توڑ دیا ہے۔

وہ شام جو اس روز میرے گھر میں اتری تھی شاید روئے زمین پر میرے لیے سب سے خوبصورت شام تھی۔ اتنا سکون، اتنی خوشی اتنا اطمینان تو میں نے اس روز بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ جس روز میں نے اوج کو سکندر کے ساتھ رخصت کیا تھا...... بہت سارے سالوں بعد میں بہت پرسکون نیند سویا تھا۔

اوج سکندر کے ساتھ اپنے گھر چلی گئی تھی اور نہال اور جمال رات گئے تک افزا کی باتیں کرتے اور اسے یاد کرتے رہے تھے......

اور پھر چند دن بعد سکندر اور اوج کو میں ہالینڈ جانے کے لیے ایئرپورٹ پر رخصت کر رہا تھا۔ وہ دونوں لیزا کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے ہالینڈ جا رہے تھے۔

"یہ آخری بوجھ تھا جو میرے دل پر دھرا تھا کہ میں نے اپنے محسن کو مایوس کیا ہے لیکن لیزا بہت خوش ہے اور سرجان بھی۔ فریڈرک ایک بہترین انسان ہے۔ اب کوئی بوجھ نہیں ہے۔"

سکندر نے جاتے جاتے میرے کانوں میں سرگوشی کی تھی اور میں دھیرے سے مسکرا دیا تھا اس لیے کہ یہ راز تو میں ہی جانتا ہوں کہ میں نے لیزا سے درخواست کی تھی کہ اگر اس کے دل میں ذرا بھی سکندر کا خیال ہے تو وہ شادی کر لے۔ ورنہ وہ پورے طور پر خوش نہ رہ پائے گا۔ اور لیزا نے میری بات رکھ لی تھی۔ اس کا فون نمبر میں نے سکندر کی ڈائری سے لیا تھا اور اس کی فائل سے میں نے جان لیا تھا کہ سکندر کے دل میں یہ احساس ہے کہ اس نے لیزا کو مایوس کیا ہے۔

"لیزا کو میرا بہت پیار دینا اور اس سے کہنا کہ وہ فریڈرک کے ساتھ پاکستان ضرور آئے۔ اپنے انکل کے گھر......"

"ضرور بلکہ ہم تو اسے ساتھ لے کر آئیں گے۔"

سکندر نے خوش دلی سے کہا۔ اس کے چہرے پر طمانیت تھی، خوشی تھی، مسرت تھی اور اس مسرت کے رنگ اوج کے چہرے پر کھل رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں جھلک رہے تھے۔ وہ دونوں مسکراتے ہوئے مجھے الوداع کہہ رہے تھے۔

اور میرا دل خوشی اور تشکر کے جذبات سے بھرتا جا رہا تھا......

اسے کہنا

اداسی، تم اسے کہنا
ہوا کے ہاتھ کچھ نہیں ہے اور صدا ویران
پھرتی ہے
تم اسے کہنا، تیرا بچھڑا ہوا
اکثر جاگتا ہے۔ سو پایا نہیں ہے
اور۔ اداسی
تم اسے کہنا
کسی کو علم کیا
جب رات ڈھلتی ہے
تو کتنے جسم جلتے ہیں
دعاؤں کے، آرزوؤں کے، وفاؤں کے
اداسی تم اسے کہنا
تم ہی دکھ میں تنہا نہیں
یہاں پر بھی ہوا کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے

شازیہ سرگانہ

بوئے گل ٹھہری نہیں رنگِ صبا سنورا نہیں
شیشۂ حسنِ نظر میں چاند کیوں اترا نہیں

پتھروں کی خامشی نے دی نہیں دل کو صدا
جب تلک میں ٹوٹ کر صحراؤں میں بکھرا نہیں

موسموں کے ساتھ راہیں بھی کئی بدلیں مگر
کاروانِ دردِ دل چلتا رہا، ٹھہرا نہیں

رات کے پُرنور ساحل کو ہے جس کا انتظار
وہ جزیرہ تو سمندر سے ابھی ابھرا نہیں

قافلے تو قافلے تھے منزلیں بھی لٹ گئیں
راہیؔ خوش فکر کا چہرا مگر اترا نہیں

سوہن راہی